PAKISTAN ACADEMY OF LETTERS
پاکستانی ادب کے معمار
ڈاکٹر سلمیٰ شاہین : شخصیت اور فن
کلثوم زیب
اکادمی ادبیات پاکستان

CamScanner

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ ''کتب خانہ'' میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

پاکستانی ادب کے معمار

پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین: شخصیت اور فن

پاکستانی ادب کے معمار

پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین: شخصیت اور فن

کلثوم زیب

اکادمی ادبیات پاکستان

پطرس بخاری روڈ، سیکٹر H-8/1 اسلام آباد

نگرانِ اعلیٰ	:	ڈاکٹر یوسف خشک
مدیرِ اعلیٰ	:	محمد عاصم بٹ
مصنفہ	:	کلثوم زیب
نظرِ ثانی	:	ڈاکٹر اسماعیل گوہر
طباعت	:	اختر رضا سلیمی
اشاعت	:	2022
تعداد	:	500
ناشر	:	اکادمی ادبیات پاکستان، H-8/1، اسلام آباد
مطبع	:	نسٹ پریس، اسلام آباد
قیمت	:	مجلد: -/245 روپے
		غیر مجلد: -/200 روپے

ISBN: 978-969-472-481-2

Pakistani Adab Kay Maimar
Prof Dr. Salma Shaheen

Written By
Kulsum Zaib

Publisher
Pakistan Academy of Letters
Islamabad, Pakistan

حسنِ ترتیب

- پیش نامہ ڈاکٹر یوسف خشک 07

☆☆☆

- پیش لفظ کلثوم زیب 09

☆☆☆

- پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین 11
- سلمیٰ شاہین کی شاعری 21
- سلمیٰ شاہین کی نثر نگاری 55
- ناول 63
- افسانے 67
- پی ایچ ڈی مقالہ 79
- تصانیف 105
- انتظامی افسر 107
- تاثرات 111
- مختلف کتابوں کے لکھے گئے پیش لفظ 121
- بطور اداریہ نگار 131
- تخلیقات سے اقتباسات 141
- شعری تخلیقات 143
- سرکاری و غیر سرکاری ممبر شپ 177
- مطبوعہ تصانیف 178

- علمی و ادبی مضامین و مطبوعات 179
- چھپ شدہ مطبوعات 181
- کتابیات 185
-

- علمی و ادبی مضامین و مطبوعات 179
- چاپ شدہ مطبوعات 181
- کتابیات 185
-

پیش نامہ

پشتو میں نسوانی ادب کی روایت میں ڈاکٹر سلمیٰ شاہین کا خاص مقام و مرتبہ ہے ۔ آپ شاعرہ ہیں، فکشن نگار ، اور محقق بھی ہیں۔ ہمارے پدر سری نظام کے حامل معاشرے میں عورت کے مقام اور کردار کے حوالے سے اُن کی تحریریں پشتو ادب میں خاص امتیاز رکھتی ہیں ۔ آپ پشتو اکیڈمی سے وابستہ ہیں ۔ متعدد تحقیقی و علمی منصوبے آپ کی زیر نگرانی جاری ہوئے اور پایہ تکمیل کو پہنچے ۔ آپ نے پشتو شعری صنف میں ٹپہ پر گراں قدر تحقیقی کام کیا اور دو جلدوں میں تیس ہزار ٹپے جمع کیے ۔

نسوانی لہجہ جس منفرد اور واضح انداز میں سلمیٰ شاہین کی شاعری میں جھلکتا ہے ۔ پشتو ادب میں اس کی مثال کم ہی کسی اور شاعرہ کے ہاں ملتی ہے۔ جب کہ آپ کی شاعری میں اُمید اور یاس کی آمیزش سے رنگ آمیزی کی گئی ہے ۔ عورت کے مسائل ،طبقاتی کشمکش ، پشتو زبان اور تہذیب سے محبت اور منافقانہ رویوں کے خلاف بغاوت اُن کی شاعری کے اجزا قرار دیئے جاسکتے ہیں ۔

اس میں شک نہیں ہے کہ کلثوم زیب نے بہت وقت نظری اور خلوص کے ساتھ اس کتاب کی تصنیف کی ہے ۔ اُن کی تحریر میں سلمیٰ شاہین سے عقیدت کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ تاہم انھوں نے اپنی تحقیق کی عمارت کو اعلیٰ معیارات کی بنیاد پر قائم کیا ہے ۔ اور اُن کی ادبی اور علمی شخصیت کے متنوع پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے ۔ جیسا کہ انھوں نے خود لکھا ہے وہ تصنیفی کام کے دوران سلمیٰ شاہین صاحبہ سے مسلسل رابطے میں رہیں ۔ اس سے بھی اُن کی تحریر کردہ کتاب کی تحقیقی حیثیت بڑھتی ہے۔

ہم اُمید کرسکتے ہیں کہ کلثوم زیب کی تحریر کردہ یہ کتاب ڈاکٹر سلمیٰ شاہین کی شخصیت اور فن کو سمجھنے میں بہت مددگار ثابت ہوگی ۔

اس کتاب کی تدوین، تزئین و آرائش اور طباعت کے لیے میں اپنے رفیق کار محمد عاصم بٹ اور اختر رضا سلیمی کا بھی ممنون ہوں۔ امید ہے کہ آپ کو حسب سابق اکادمی کی یہ کاوش بھی پسند آئے گی۔

ڈاکٹر یوسف خشک میریٹوریس پروفیسر
چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان
اسلام آباد

پیش لفظ

تحقیق و تنقید ایک مشکل اور توجہ طلب کام ہے۔ اس کے لیے آپ کو تحقیقی توانائی سے لیس ہو کر کام کرنا پڑتا ہے۔ داخلی اور خارجی شہادتوں کو یکجا کرنے کے لیے کئی کٹھنائیوں سے گزرنا پڑتا ہے۔

ایک شخصیت کی خدمات کو دیکھنا پرکھنا اور اسے اپنے معنی پہنانا سب سے مشکل کام ہوتا ہے، اور جب آپ کسی ایسے تخلیق کار پر قلم اٹھاتے ہیں جو آپ کے قریب ہو تو اس کی زندگی، شخصیت اور تخلیقی صلاحیتوں کو جانچنا اور بھی کٹھن مرحلہ ہو جاتا ہے۔ ایسی ہی ایک شخصیت پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین کی ہے۔ وہ اس پدر سری معاشرے میں عورتوں کی تعلیم و ترقی کے لیے میدان میں عزم و حوصلے کی مثال ہیں۔ میں پہلی بار ان سے ۱۹۹۶ میں پشتو اکیڈیمی میں ملی۔ اس وقت وہ بطور ریسرچ افسر وہاں کام کر رہی تھیں۔ کرسی پر ایک مسکراتی ہوئی نفیس شخصیت کو دیکھ کر ایک فرحت بخش احساس ہونے لگا تھا یوں لگا جیسے وہ ہماری سالوں پہلے کی شناسا ہوں۔ اس وقت وہ خوشحال بابا پر کوئی مقالہ لکھ رہی تھیں اگرچہ یہ ایک مختصر سی ملاقات تھی مگر معمولی ہرگز نہیں تھی۔

تیس منٹ کی اس ملاقات نے میرے دل کو چھو لیا تھا۔ پھر کبھی کبھار ہی ان کو دور سے دیکھنے کا موقع ملتا رہا۔ اس ملاقات نے یوں میرے دل کو چھوا کہ ابھی تک اس سحر سے نہیں نکل پائی ہوں۔ بطور ناول نگار، محقق، افسانہ نگار، شاعر بہت سے لوگوں نے ان کی تحریروں کو پڑھا مگر میں نے خود سلمیٰ شاہین کو پڑھا۔

اس پدر سری نظام میں خواتین کے لیے ان کے دل میں درد ہے۔ ان سے قلم اور عقیدت کے رشتے کے علاوہ احساس کی چاشنی کا ایک بندھن بھی ہے جو مجھے اچھا لگتا ہے اور جس پر مجھے فخر ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کہیں نہ کہیں میری ذات میں ان کی پرچھائی چھپی ہوئی ہے۔ ان پر لکھنا اور ان کے لیے لکھنا میرے لیے ایک اعزاز ہے۔

یہ اعزاز شاید میرے نصیب میں تھا جب باتوں باتوں میں مرحوم ڈاکٹر یاسر علی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں ان پر لکھوں۔ میں ان کی زندگی بھر احسان مند رہوں گی کیونکہ یہ راستہ انہی کا دکھایا ہوا ہے۔ ان کی زندگی وفا نہ کر پائی اور وہ ہم سے بے وقت بچھڑ گئے۔ اللہ انھیں جنت میں اعلیٰ مقام دے آمین۔ ان کے چلے جانے کے بعد بھی اکادمی ادبیات کے دوستوں نے مجھے بہت سپورٹ کیا مجھے ہمت دی حوصلہ دیا۔

تحقیق کا کام لمبے عرصے تک چلتا ہے۔ سلمیٰ بی بی کا کام بہت ہے، متنوع ہے۔ زیادہ تر تحقیق پر مبنی ہے۔ ایک کتاب میں اس کو سمیٹنا مشکل ہے۔ مگر اپنی طرف سے میں نے کوشش کی ہے کہ ان کے کام کا بھرپور تعارف اس کتاب میں کرا سکوں۔

ادارہ اکادمی ادبیات کی ادبی تحقیقی خدمات ملک بھر کے ادبی حلقوں کے لیے قابل ستائش ہیں۔ یوں تمام زبانوں کو ایک نظر سے دیکھنا ان زبانوں کو اہمیت دینا پیار دینا وقعت دینا، وقت دینا واقعی میں قابل تعریف ہے اور اس کام میں ادارے کے منتظمین کے ساتھ ساتھ سب سے بڑا حصہ موجودہ چیئرمین جناب یوسف خشک صاحب کا ہے۔

ان کا پیار یقیناً تمام قومیتوں اور ان کی زبانوں کے لیے قابل ستائش ہے۔ ان کی اپنی دلچسپی اور نگرانی اور پھرتی سے یہی تاثر ابھرتا ہے کہ پاکستانی ادب کی ترقی کے راستے مزید کھلیں گے۔

میں اکادمی ادبیات کے ساتھیوں کی تہہ دل سے ممنون ہوں کہ جن کی دلچسپی سے یہ پراجیکٹ مکمل ہو سکا۔ میں ڈاکٹر یوسف خشک صاحب چیئرمین اکادمی ادبیات پاکستان کی شکر گزار ہوں جنھوں نے اس منصوبے کی اشاعت میں خصوصی دلچسپی لی اور مسودہ زیور طباعت سے سج کر آپ کے سامنے ہے۔

کلثوم زیب

پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین

(شخصیت، تعلیم، ملازمت)

پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین ۱۱ اپریل ۱۹۵۷ء کو ضلع مردان کے گاؤں بغدادہ میں امیر محمد خان کے گھر پیدا ہوئیں۔ امیر محمد خان پیشے کے لحاظ سے زمین دار تھے۔ ان کی سیاسی وابستگی عبد الغفار خان المعروف باچا خان کی خدائی خدمت گار تحریک سے تھی۔ وہ باچا خان کے ابتدائی ساتھیوں میں تھے۔ سلمیٰ شاہین کے والد کی شادی ۱۷ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ وہ پانچ بہنیں اور دو بھائی ہیں، بہن بھائیوں میں وہ دوسرے نمبر پر ہیں۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم بغدادہ گاؤں کے سرکاری سکول میں حاصل کی۔ میٹرک کا امتحان گورنمنٹ گرلز ہائی سکول مردان سے ۱۹۷۱ میں پاس کیا۔ ایف اے ویمن کالج مردان سے ۱۹۷۳ میں اور بی اے ۱۹۷۶ میں مکمل کیا۔ ایم اے پشتو یونیورسٹی آف پشاور سے ۱۹۷۸ میں پاس کیا۔ اسی یونیورسٹی سے ۲۰۰۲ میں پی ایچ ڈی مکمل کی اور اسی سال پشاور یونیورسٹی کی پشتو اکیڈمی میں ریسرچ آفیسر کے عہدے پر تعینات ہوئیں۔ اسی اکیڈمی سے ڈائریکٹر کے عہدے سے ریٹائر ہوئیں۔ سلمیٰ شاہین نے شادی نہیں کی۔

ان کے والد ۱۹۳۸ میں خدائی خدمت گار تحریک سے منسلک ہوئے اور مسلسل سیاست سے وابستہ رہے۔ جب ایوب خان کے خلاف ون یونٹ کے سلسلے میں تحریک چلی تو اس دوران ان کے والد بھی گرفتار ہوئے اور پانچ سال کا عرصہ جیل میں گزارا اور صعوبتیں برداشت کیں۔ اس گرفتاری کا اثر ان کے بچوں پر بھی ہوا۔ جب وہ گرفتار ہوئے تو گھرانے کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ بچوں کی نگہداشت اور تعلیم و تربیت کی ذمہ داری ان کی ماں اور ایک کنواری پھوپھی پر آن پڑی۔ سلمیٰ شاہین کی ماں ایک بہادر خاتون تھیں۔ اپنی دکانوں کے کرائے پہ گزر اوقات کرتیں اور مردوں کی طرح کام کاج بھی کیا کرتی تھیں۔ وہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن بہت سمجھ دار اور معاملہ فہم خاتون تھیں۔ اپنے بچوں کو باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دی۔

سلمیٰ شاہین کا بھائی ڈاکٹر نگار احمد کانونٹ سکول رسالپور میں پڑھتا تھا۔ اس سکول میں یوم والدین کی تقاریب اور دیگر ضروری تقریبات میں بھی شرکت کیا کرتی تھیں۔ بچے جب سکول سے واپس آتے تو ان کی کاپیاں ایسے دیکھا کرتی جیسے پڑھی لکھی خاتون ہو۔ سکول جا کر بھی اساتذہ سے تکرار کرتی کہ آپ اساتذہ کاپیاں چیک کرتے ہوئے سرخ قلم کا استعمال کیوں نہیں کرتے۔ ایک بار جب سب بچے والد سے ملنے جیل گئے تو سب سے چھوٹے بیٹے شہریار نے پیسوں کی خاطر والد کی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ پیسے نہ پا کر رونے لگا تو والد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شوہر کی غیر موجودگی میں سلمیٰ شاہین کی ماں نے اپنا زیور بیچ کر بچوں کو پڑھایا۔ طبیعت کی وہ سخت تھیں اور بچوں کو خوب ڈانٹا کرتیں تھیں اور سبھی بچے ان سے ڈرتے تھے۔

سلمیٰ شاہین کو اپنے بچپن کی بہت ساری باتیں یاد ہیں۔ بتایا کہ وہ اپنی سہیلیوں کے ساتھ کھیل کود میں مگن رہتی تھی۔ پیڑ پر چڑھ کر بیریاں کھاتی اور گلی میں چینده رو کھیلا کرتی تھی۔ یہ بھی بتایا کہ خوب شرارتیں بھی کر لیا کرتی تھی۔ ایک روز جب ابا جیل میں تھے، میں نے شاہ توت کے پیڑ پر پتھر مارا جو میرے بھائی کو لگا اور وہ زخمی ہو گیا۔ میں نے الزام ایک اور لڑکے پر لگایا۔ اسے بہت مار پڑی۔ میرے والد میری والدہ کی بہت تعریفیں کرتے تھے کہ اس نے میری غیر موجودگی میں بچوں کی اچھی تعلیم و تربیت کی۔ ابا کے جیل کے ساتھیوں میں اجمل خٹک، پروفیسر جہانزیب نیاز اور بخش خلیل بھی تھے۔ یہ سب ملتان جیل میں قید تھے۔ جیل کی خراب خوراک کے باعث ابا کی صحت بہت خراب ہو گئی تھی۔ وہ جیل میں قیدیوں کے لیڈر تھے۔ جیل میں قیدیوں کو چائے نہیں ملتی تھی۔ صرف گڑ اور چنے کھانے کو ملتے تھے۔ سب نے احتجاج کیا اور یوں قیدیوں کے لیے چائے کی منظوری دے دی گئی۔ قیدیوں میں صوابی کے ایک شاعر سعادت خان جلیل بھی تھے۔ اس نے چائے کی منظوری پر ایک طویل چاربیتہ بھی لکھا تھا۔

سلمیٰ شاہین کی ایک کنواری پھوپھی آفتاب تھی جو گھریلو حالات سے پریشان ہو کر روتی تھی۔ مگر ماں مضبوط دل تھی اور حالات کا خوب مقابلہ کرتی تھی۔ اگرچہ خو کی سخت تھی اور شوہر سے لڑائی جھگڑا بھی کیا کرتی تھی لیکن مشکل حالات میں ان کا خوب سہارا بنتی تھی۔

سلمیٰ شاہین بچپن ہی سے ذہین تھی اور کتابوں کی دلدادہ تھی۔ والد سیاسی ذہن کے مالک تھے اور گھر میں مطالعہ کے لیے مختلف قسم کی کتابیں دستیاب تھیں۔ چھوٹی عمر میں مولانا

مودودی کی کتب اور دیگر مذہبی اور تاریخی کتابیں پڑھیں۔ خوشحال خان خٹک کی کلیات کا مطالعہ کیا۔ لکھنے کا شوق بھی بچپن ہی سے تھا۔ ایک ڈائری میں اشعار اور ٹپے لکھا کرتی اور سکول میں نظمیں اور ترانے سناتی رہتی تھی۔ والد کا حافظہ بہت تیز تھا۔ سینکڑوں اشعار یاد تھے۔ غنی خان، اجمل خٹک امیر نواز جلیا اور شاد محمد میکش کے اشعار زبانی سنایا کرتے تھے۔ صبح سویرے اکثر یہ شعر سنا کر بچوں کو جگایا کرتے تھے:

جوانی میں عدم کے واسطے سامان کر غافل
مسافر شب کو اٹھتے ہیں جو جانا دور ہوتا ہے

سلمیٰ شاہین نے بچپن کے واقعات میں یہ بھی بتایا کہ میری ماں ناخواندہ تھی لیکن ایک جلسے کی صدارت کی تھی۔ اس دن میں نے سرخ کپڑے پہن رکھے تھے اور عینک لگا رکھی تھی۔ میں نے اس جلسے میں غنی خان اور اجمل خٹک کی نظمیں سنائی تھیں۔ شاعری کے ساتھ ساتھ ناول بھی پڑھا کرتی تھی۔ گاؤں میں ایک چھوٹے سے کمرے میں ایک لائبریری قائم تھی۔ چھ پیسے میں ایک رات کے لیے ناول ملتا تھا۔ رات کے لیے ناول لاتی۔ رات ہی میں ختم کر کے صبح واپس کر دیتی تھی۔ ان میں میکسم گورکی کا ناول "ماں" بھی شامل تھا۔ میکسم گورکی، ماؤزے تنگ اور دیگر ایسے ادیبوں کی کتابیں پڑھیں جو سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تھے۔ سماجی اور سیاسی شعور زیادہ تر سماجی اور سیاسی جلسوں سے حاصل ہوا۔

سلمیٰ شاہین کے افسانوں، ناول اور شاعری میں طبقاتی شعور اسی تربیت کا نتیجہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۶۹ میں ذوالفقار علی بھٹو نے پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی اور روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگایا تو سلمیٰ کو بہت اچھا لگا تھا۔

سلمیٰ کے دادا آرمی آفیسر تھے جن کے بڑے بیٹے غلام نبی خان رائل برٹش ایئر فورس میں پائلٹ تھے۔ اور دوسری جنگ عظیم ۱۹۴۱ میں Deccan ایئر کریش میں جاں بحق ہوئے۔ دوسرے بیٹے کو بھی جنگ میں کھو دیا تو دو جوان بیٹوں کی موت کے بعد تیسرے بیٹے جو سلمیٰ شاہین کے والد تھے کو میٹرک کے بعد تعلیم سے اٹھا دیا۔ ان کو خوف تھا کہ یہ بیٹا بھی پڑھ لکھ کر فوجی ملازمت اختیار کرے گا اور جنگوں میں مارا جائے گا۔ سلمیٰ کے والد نے ساتم دارم سکول سے میٹرک کیا تو مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ ان کا ادبی ذوق خوب تھا۔ اخبار اور کتابوں کا مطالعہ روز کا

معمول تھا۔ جیل میں رہ کر قرآن کا ترجمہ پڑھا۔ جیل ہی میں رباب اور ستار بجانا بھی سیکھ لیا تھا۔ وہ بہت اچھے ستار نواز تھے۔ بچوں کو ساتھ بٹھا کر خوبصورت دھنیں سنایا کرتے تھے۔ ان کی شادی ۲۱ سال کی عمر میں ہوئی تھی۔ پہلے جن چار بچوں نے اپنے والد کو دیکھا تھا ان میں سلمیٰ شاہین بھی تھی۔ انہیں فٹ بال کھیلنے کا بھی شوق تھا۔ سوئمنگ اور گھڑ سواری میں بھی مہارت حاصل تھی۔

سلمیٰ شاہین نے اردو اور پشتو شاعری کا خوب مطالعہ کیا ہے۔ اس کے زمانہ طالب علمی میں اردو کتابیں اور رسالے زیادہ دستیاب تھے چنانچہ اردو شعر و ادب پڑھا لیکن مادری زبان پشتو تھی اور جلد ہی پشتو ادب کی طرف توجہ ہوئی۔ کالج میں پشتو بطور مضمون لیا اور آگے بھی پشتو ادب کی تعلیم حاصل کی۔ اور پشتو ہی میں پی ایچ ڈی کی۔

سلمیٰ شاہین نے عملی زندگی میں ہر قسم کے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ ہر تکلیف کو عزم و حوصلے کے ساتھ برداشت کیا۔ ماں باپ کی بیماری اور پھر موت کے صدمے حوصلے سے برداشت کیے۔ ملازمت کی ذمہ داریاں پوری تندہی اور فرض شناسی کے ساتھ ادا کیں اور گھریلو پیچیدگیوں کو خوب نبھایا۔ بظاہر وہ بہت حوصلہ مند اور پُر عزم دکھائی دیتی ہیں لیکن ریٹائرمنٹ کی بعد کی عمر میں بھی ان کا کہنا ہے کہ "مجھے آندھی طوفان اور مردوں سے ڈر لگتا ہے مگر یہ کسی کو معلوم نہیں ہے"

سلمیٰ شاہین نے ایک روایتی پشتون گھرانے میں پرورش پائی لیکن اس گھرانے میں کچھ باتیں ایسی ضرور تھیں جو دوسرے خاندانوں میں نہیں تھیں جیسے ان کے والد کو صوابی کے صوبت نامی ایک خوش الحان گلوکار کی آواز بہت بھلی لگتی تھی۔ جب کبھی وہ بلند اور کی مسجد میں آ کر میلاد کی محفل میں لاؤڈ سپیکر پر نعت پڑھتا تو ان کے والد خود بھی بہت انہماک سے سنتے اور بیوی کو بھی نعت سننے کے لیے بلا لیتے تھے۔ وہ عورتوں سے بہت نرمی سے پیش آتے تھے۔ غیر ضروری محافل میں نہیں جاتے تھے۔ حجرے میں رقاصائیں آ جاتی تھیں تو دیکھنے نہیں جاتے تھے۔ والد کی تمام خصوصیات ان کی اولاد کی بھی شخصیت کا حصہ ہیں۔ ان کی والدہ بھی کھلے دل کی مالک تھی۔ عیسائی خواتین کو گلے لگاتی تو سلمیٰ کی پھوپھی کو غصہ آتا تھا۔ سلمیٰ کی ماں سگریٹ بھی پیتی تھی۔ ان کی چچی حقہ پیتی اور افیون بھی کھایا کرتی تھی۔ لیکن سلمیٰ نے ان کی یہ عادتیں نہیں اپنائیں۔ ان کی والدہ درزی کو بلا کر اور گھر کی ڈیوڑھی میں بٹھا کر اپنے سامنے کپڑے سلواتی تھی۔

سلمیٰ بچپن میں چندروہ میر گوٹی اور بوری بند جیسے کھیلوں میں حصہ لیتی تھی۔ پھول بھی کاڑھے اور

سویٹر بھی بنے۔ اپنی گڑیوں کے لیے سامان خود بناتی تھی۔ ہاؤس ہولڈ اور ہوم اکنامکس کی کلاسز میں کھانے پکانے سیکھے۔ ریاضی کا مضمون بالکل پسند نہیں تھا۔ سکول میں ریاضی کی کلاس سے اکثر چھپ جایا کرتی تھی۔ انگریزی اور اردو پسندیدہ مضامین تھے۔ اکثر ان مضامین میں گروپ لیڈر ہوتی تھی۔ سکول ہی کے دنوں میں شکیل بدایونی اور عبدالحمید عدم کو پڑھا تھا۔ پریم چند، سعادت حسن منٹو، امتیاز علی تاج، سجاد حیدر یلدرم، نسیم حجازی، سلمیٰ کنول اور رشید بٹ کے افسانے اور ناول شوق سے پڑھے۔ سکول میں اردو اور پشتو نظمیں شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ سکول اور کالج کے مباحثوں میں حصہ لیا اور کئی انعامات جیتے۔ سکول کے دنوں میں ایک انعامی مقابلے کے لیے اردو میں مضمون لکھا اور پہلی پوزیشن حاصل کی حالانکہ اس مقابلے میں اردو بولنے والی لڑکیاں بھی شامل تھیں جو اس کے پڑوس میں رہتی تھیں۔ وہ ہندوستانی مہاجر تھیں اور بکٹ گنج شام سے آئی تھیں۔ سکول میں عام طور پر اردو بولی جاتی تھی۔ اساتذہ اور بچے اردو ہی میں بات کرتے تھے۔

سلمیٰ نے سکول کالج کے زمانے ہی سے شعر گوئی کا آغاز کر دیا تھا۔ ایک بار جو ائیز کالج مردان میں مشاعرہ ہو رہا تھا۔ سلمیٰ نے ایک طرحی غزل لکھ کر اپنی ایک سہیلی کو دے دی۔ اس نے مشاعرے میں نظم سنائی اور دوسرا انعام حاصل کیا۔ اس وقت پروفیسر اماجان اما مردان کالج میں تھے اور طرح مصرعہ انہوں نے اپنی ہی ایک غزل کا یہ دیا تھا:

راژئ چہ اے ملگرو د روزگار خبرے او کڑو

(آؤ دوستو کہ روزگار کی باتیں کریں)

سلمیٰ اردو، پشتو اور انگریزی مباحثوں میں شوق سے حصہ لیتی اور انعامات پاتی تھی۔ ایک بار پشاور یونیورسٹی کے شعبہ انٹر نیشنل ریلیشن میں پشتو تقریری مقابلہ تھا۔ موضوع تھا:

د ننگ بنگڑی سڑو تہ ترو چہ سر کڑے دی

(عزت کی چوڑیاں عورتوں نے مردوں کو پہنائی ہیں) سلمیٰ شاہین کے مدمقابل افراسیاب خٹک تھے۔ جنہوں نے پہلی اور سلمیٰ نے دوسری پوزیشن حاصل کی۔ افراسیاب خٹک پشتو میں بہت دلچسپی لیتے تھے اور ان کی وجہ سے سلمیٰ کو بھی پشتو سے رغبت پیدا ہوئی۔ وہ جب تھرڈ ایئر میں تھی اس وقت پشاور یونیورسٹی میں پشتو ڈیپارٹمنٹ کے چیئرمین پریشان خٹک تھے۔ ایک تقریری مقابلہ تھا جس کے عنوان کے طور پر یہ شعر دیا گیا تھا:

کہ طالع او ہنر دواڑہ سرہ کیگدے
زہ خوشحال بہ تریہ پورتہ کڑم ہنر
(اگر قسمت اور ہنر دونوں سامنے رکھ دیئے جائیں تو میں خوشحال خان ان میں ہنر کو چنوں گا)

اس مقابلے میں بھی افراسیاب خٹک نے پہلی اور سلمیٰ شاہین نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ سکول اور کالج کے زمانے میں لڑکیوں کا باہر بازاروں میں جانا ممکن نہیں تھا۔ سلمیٰ کہتی ہیں کہ کالج کے زمانے میں میں نے پہلی بار پشاور کا اندرون شہر دیکھا۔ مس بخاری جسے شاہ بی بی کہتے تھے میرے ساتھ تھیں اور ہم نے بہت سی جیولری خریدی تھی۔ شاہ بی بی ہری اردو لیکچرر تھیں جو پہلے زنانہ کالج مردان اور پھر فرنٹیئر کالج میں اردو کی پروفیسر تھیں۔ وہ بہت اچھی شاعرہ تھیں اور میں ان سے اپنی شاعری کی اصلاح لیتی تھی۔ مجھے منفرد لائف سٹائل اور ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ شاہ بی بی سے ان موضوعات پر گھنٹوں باتیں ہوتی تھیں۔ مردان کالج میں پشتو کی پروفیسر اقبال خٹک سے پشتو ادب کو پڑھنے اور سمجھنے میں بہت رہنمائی ملی۔ ان دونوں اساتذہ کا تعلق پشاور سے تھا اور ان دونوں نے میرے علمی اور ادبی ذوق کو سنوارا۔ بچپن میں سلمیٰ کی نگہداشت جنت بی بی سور نے کی۔ اس بارے میں انہوں نے بتایا:

جب میرے بعد میرا بھائی پیدا ہوا تو اس کی پرورش میں مجھے نظر انداز کر دیا گیا۔ جنت بی بی سور کا تعلق سوات سے تھا۔ وہ ہمارے ہی پاس رہتی تھی۔ گھر میں کام کاج کرنے والی عورتیں بھی آتی تھیں اور چھوٹے بچوں کے لیے آیا رکھنے کا رواج بھی تھا۔ میرے بعد میرا بھائی نگار احمد پیدا ہوا تھا۔ تب میں جنت بی بی سور کے پاس ہی رہا کرتی تھی۔ وہ بہت مخلص عورت تھی۔ اس زمانے میں مالک اور نوکر میں فاصلہ بہت کم ہوتا تھا۔ وہ بھی گھر کا فرد شمار ہوتا تھا۔ میں غریبوں میں پلی ہوں۔ مجھے غریبوں سے محبت ہے۔ میں نے وہی ادب پڑھا ہے جو غریبوں سے متعلق لکھا گیا ہے۔ میں اس حوالے سے بہت حساس ہوں۔ جب پشتو ٹپے پر تحقیقی کام کیا تو یہ احساس اور بھی شدت اختیار کر گیا اور اب بھی ہے کہ "سب لوگوں کو بھوک لگتی ہے اور سارے لوگ تھکن محسوس کرتے ہیں۔ تمام انسانوں کو محبت، ہمدردی، وسائل اور فراغت کی ضرورت ہوتی ہے۔ سب کو یہ ملنا چاہیے"

سلمیٰ شاہین بہت رحم دل خاتون ہے۔ جب ان کی ماں بیمار ہوتی تب راتوں کو اٹھ اٹھ کر

ان کی خدمت کرتی تھی۔ ان کو درد محسوس ہوتا تو پانی گرم کر کے بوتل بھر لیتی اور ان کا ٹکور کرتی تھی۔ گھر کے کام بھی کرتی تھی۔ اس مشترکہ گھرانے میں ماں باپ، پھوپھی چچی اور ان کی شادی شدہ بیٹی جو میکے بیٹھ گئی تھی کل ملا کر بارہ لوگ تھے۔ رشتہ داروں اور مہمانوں سے بھی گھر بھرا رہتا تھا۔ رات کو خوش گپیاں ہوتیں۔ محبت اور اعتماد کا صاف ستھرا ماحول تھا۔ لڑائیاں اور جھگڑے بھی ہوتے مگر دلوں میں کدورت اور منافقت نہ تھی۔ جلدی صلح بھی ہو جاتی تھی۔ شادی بیاہ اور غم کے مواقع پر سارے رشتہ دار مل جل کر کام کرتے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ ماں باپ دونوں خوش خوراک تھے۔ بیماری کے باوجود دونوں کو اچھے کھانوں کا شوق تھا۔ دونوں ہم عمر تھے اور دونوں بلڈ پریشر کے مریض تھے۔ ماں ۶۸ سال کی عمر میں ۱۹۹۸ء میں فوت ہوگئیں اور باپ کا انتقال ۶۹ سال کی عمر میں ۱۹۹۵ء میں ہوا تھا۔ دونوں رشتے میں چچازاد تھے۔ سلمیٰ کی امی کو پالتو جانور پالنے اور ٹوکری لگا کر پرندے پکڑنے کا بھی شوق تھا۔

سلمیٰ نے کالج کے زمانے میں ترقی پسند لٹریچر پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ اپنی تقریروں میں ترقی پسند ادب سے اقتباسات شامل کرتی تھی۔ کالج ہی کے زمانے سے عورتوں کی بے چارگی اور بے بسی کو محسوس کرنے لگی تھی۔ وہ عورتوں کو دکھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ ان کی نظم و نثر میں عورتوں کی زندگی کے کرب دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری طبقاتی معاشرے کے خلاف ہے۔ ان کی شاعری غربت اور عورت پر مظالم کے خلاف ان کی صدائے احتجاج ہے۔ ان کے افسانوں اور ناول میں بھی ان کی یہی فکر نمایاں ہے۔ سلمیٰ نے اپنی ماں کے بارے میں بتایا کہ وہ اچھی قصہ گو تھی۔ ہمیں کہانیاں سناتی اور چار بیتے، ٹپے اور گیت بھی گاتی رہتی تھی۔ جیسے یہ گیت اکثر گنگناتی رہتی تھی:

پہ توروشپہ کے اوازونہ

وہ توروبلبلہ ناخاروہ

خوگہ اشنادے قتل کڑوو زمانہ

ترجمہ: سیاہ راتوں میں آوازیں دینے والے اداس بلبل تو نے مجھ سے میرے محبوب کو جدا کر دیا ہے۔

ماں خوش گلو تھی، رشتہ داروں کی شادیوں میں خوب گاتی تھی۔ سلمیٰ بے جا سماجی پابندیوں کے خلاف ہے۔ جب خواتین مختلف قسم کی معاشرتی پابندیوں کو برداشت کرتیں تو سلمیٰ

کو اس کا شدت سے احساس ہوتا تھا کہ ہماری خواتین کتنی مجبور ہیں۔ عورتوں پر بے جا پابندیاں اس کو انسان کے فطری جذبوں کے خلاف لگتی تھیں۔ اس طرح کی زندگی گزارنا اس کو اچھا نہیں لگتا تھا۔ گھر میں بھی کئی مواقع پر روایتی پابندیوں کے خلاف رہی اور یہ رویہ ساری عمر رہا۔ حق بات کے لیے ڈٹے رہنا اس کی فطرت ہے۔ حق گوئی اور بے باکی کے سبب کئی بار مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن حوصلے، ہمت اور راست گوئی نے اسے جھکنے نہیں دیا۔ یہ عزم اور حق گوئی انہوں نے ادب کے مطالعے سے بھی سیکھی۔ خوشحال خان خٹک، رحمان بابا، علامہ اقبال، فیض احمد فیض، ن۔ م راشد، غنی خان، پریشان خٹک اور نواز طائر کو پڑھا۔ ترقی پسند ادب سے بھی کافی متاثر رہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمیشہ انسانی مجبوریوں اور محرومیوں پر لکھا۔

سلمیٰ کو ہمیشہ چیلنجز کا سامنا رہا۔ مگر وہ ہر میدان میں ڈٹی رہیں اور ہر مشکل کا مقابلہ کر کے خود کو منوایا بھی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد سیاست میں آنے کا بھی سوچا لیکن اپنی طبیعت کے باغیانہ پن کے باعث اس میدان میں قدم نہیں رکھا۔ ان کے خیال میں خواتین کے لیے سیاست میں حالات بھی سازگار نہیں ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد بھی پشتو اکیڈمی، کلچرل میوزیم اور لائبریری جانا پسند کرتی ہیں۔ پشاور یونیورسٹی سے ان کو بہت محبت ہے کیونکہ زندگی کے چالیس سال یہاں گزارے ہیں۔ یہاں سے ان کی بہت سی یادیں وابستہ ہیں۔ یہاں ان کی بڑی علمی شخصیات سے ملاقاتیں اور نشستیں ہوئیں اور اچھے دوست بھی ملے۔ پریشان خٹک، جہانزیب نیاز، نواز طائر، ڈاکٹر محمد اعظم اعظم، ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک جیسے احباب کو ہمیشہ یاد کرتی ہیں۔

سلمیٰ شاہین سبھی تعلیم یافتہ خواتین اور خاص طور پر خواتین لکھاریوں کے لیے عزم و ہمت کی ایک مثال ہیں۔ وہ ایک عزم اور حوصلے کا نام ہے۔ ان کے دل میں خواتین کے لیے خلوص اور ہمدردی کے جذبات ہیں۔ ملازمت کے دوران بڑے انتظامی عہدے پر تھی لیکن کسی موقع پر طبیعت کی عاجزی کم نہیں ہوئی۔ ہمیشہ لڑکیوں کا حوصلہ بڑھایا اور ان کی مدد کی۔ ان کی شفقت اور رہنمائی کی وجہ سے کئی لڑکیوں نے ایم فل اور پی ایچ ڈی کی۔ وہ کمزور خواتین کے ساتھ کھڑی ہو جاتی ہیں۔ باہمت اور حوصلہ مند خواتین کو پسند کرتی ہیں۔ ہمیشہ سچائی کا ساتھ دیا اور سچ پر ڈٹی رہتی۔ ان کی سچائی کے باعث جہاں ان سے پیار کرنے والے بہت ہیں وہاں کچھ ایسے بھی ہیں جو ان کی صاف گوئی کو پسند نہیں کرتے۔ اس بات کا ان کو بھی احساس ہے لیکن حق بات کے لیے انہوں نے

کبھی بھی پیچھے ہٹنے اور میدان چھوڑنے کو پسند نہیں کیا۔ پشتو میں ایسی عورتوں کے لیے ایک جملہ بولا جاتا ہے "زروان منڈ بر تزہ" یعنی جوانمرد عورت۔ جس کے حوصلے ہمیشہ بلند اور مضبوط ہوں۔ اس ضمن میں ان کا کہنا ہے: "زندگی آزمائشوں کا دوسرا نام ہے۔ اس کی مثال کالے پانی کے سمندر جیسی ہے۔ اس میں ڈوب جاؤ اور کمال ہنر و ہوشیاری سے ابھر کر باہر آنا آسان نہیں ہے۔ زندگی کے سمندر میں وہی ڈوب کر ابھرتے ہیں جو تیرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ زندگی کے سرد اور گرم تھپیڑے انسان کو کندن بنا دیتے ہیں۔" سلمی نے زندگی جس طرح گزاری ہے اس کے لیے کوئی پیش بندی نہیں تھی۔ اور نہ ہی ایسی زندگی کے خواب دیکھے تھے۔ جب بھی کسی مشکل کا سامنا کرنا پڑا، فولادی عزم کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

انہوں نے نظم و نثر بھی ایک عزم کے ساتھ لکھی۔ کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوئی۔ انسانوں کے رویے، مکر و فریب، دروغ گوئی سب کچھ ان کی تحریروں میں جذبے کی شدت کے ساتھ موجود ہے۔ ان کا ناول "کہ رنڑا شوہ" (اگر روشنی ہو گئی) اور افسانوی مجموعہ "کانڑی او ازغی" (پتھر اور کانٹے) انسانی زندگی کے گہرے مطالعے کے حامل ہیں۔ یہ کہانیاں درمیانے طبقے کی عورتوں کی زندگی کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کو خدا نے زرخیز ذہن دیا ہے۔ جو بھی لکھتی ہیں زبان کی شیرینی سے تحریر کو دلچسپ بنا دیتی ہیں۔

انہوں نے دوران ملازمت کئی ادبی اور علمی کانفرنسوں اور سیمیناروں میں شرکت کی اور مقالے پڑھے۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے بورڈ آف گورنرز کی ۶ سال ممبر رہیں۔ کمال فن ایوارڈ میں پانچ بار شرکت کی۔ بانو قدسیہ، اجمل خٹک، فہمیدہ ریاض، منیر بادینی اور سوبو گیان چندانی کے کمال فن ایوارڈ کی جیوری میں شامل رہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے اپنے تاثرات میں کہا: "یہ بھی بہت خوشگوار تجربہ رہا۔ جب کوئی جیوری میں بیٹھ کر اپنے آپ کو منصف کی جگہ رکھے اور اس دوران اچھے فیصلے کرے"

باب دوم

سلمیٰ شاہین کی شاعری

شاعری انسانی احساسات وجذبات اور زندگی کے تجربات کی مظہر ہوتی ہے۔ سلمیٰ کی شاعری طبقاتی کشمکش سے عبارت ہے۔ اس نے جو کہا اور لکھا وہ حالات نے اس کہلوایا اور لکھوایا ہے۔ ہم اس تناظر میں کہہ سکتے ہیں کہ اس کی شاعری مقصدیت سے بھرپور ہے۔ ان کی ایک نظم "زہ وا خفے وزوہ" (میں اسی طرح چھوٹی ہوتی) انہوں نے ۱۹۸۲ میں کہی اور خیبر میڈیکل کالج پشاور کے مشاعرے میں پڑھی۔ نواب علی یوسفزئی اس وقت ریڈیو پاکستان پشاور کے ڈائریکٹر تھے۔ انہوں نے اس پروگرام کو ریکارڈ کروا کر نشر کیا۔ اس نظم کو سننے والوں نے بہت پسند کیا۔ بعد میں معشوق سلطان اور نغمہ نے ریڈیو کے لیے اس نظم کو گایا۔

سلمیٰ شاہین کی پہلی کتاب ۱۹۸۲ میں "نوے سحر" (نئی صبح) شائع ہوئی۔ اس میں زیادہ تر آزاد نظمیں ہیں۔ وہ پابند نظم اور غزل بھی کہتی ہیں لیکن طبع آزاد نظم کے لیے زیادہ موزوں ہے۔ ان کی ایک آزاد نظم مقبول گلوکار سردار علی ٹکر نے کم عمری میں گائی تھی۔ ان کے افسانوں کی طرح ان کی بیشتر نظمیں بھی معاشرتی عکاسی پر مبنی ہیں۔ غربت، سماجی ناانصافی اور پسماندہ طبقات کے دیگر سماجی مسائل ان کی نظموں کے اہم موضوعات ہیں۔ ان کی شخصیت ان کی شاعری سے جھلکتی ہے۔ ان کی شاعری میں مایوسی اور ناامیدی کی ایک فضا قائم رہتی ہے لیکن وہ اس میں امید کے چراغ روشن رکھتی ہیں۔ نظم "حوصلہ" اسی امید کا عکس ہے۔ وہ منزل پانے سے مایوس نہیں ہیں۔ خود کو حوصلہ دیتی ہوئی کہتی ہیں:

دا مخالف باد ونہ
بہ ہم چلیگی واے
خو میړنۍ زړه وران
د سرورو شاہینان

وے بے نیازہ وی ہر سہ نہ

او منزل تہ رسی

ترجمہ: یہ باد مخالف یونہی چلتی رہے گی۔ مگر باہمت جو افراد اور بلند چوٹیوں کے شاہین ہر چیز سے بے نیاز اپنی منزل کو پہنچیں گے۔

طبقاتی کشمکش سلمیٰ کی شاعری کا اہم موضوع ہے۔ وہ پسماندہ طبقات کے حالات اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہیں۔ ان کا قلم ہمیشہ سے ان طبقات کے حقوق کے لیے لکھتا رہا ہے۔ جیسے کہا ہے:

دیو غریب ڈائے نشتہ دے

دا خاذن امیران ڈیر دی

گورہ ستا دلاسہ ناتوان

پہ جہان ڈیر دی

ترجمہ: ایک غریب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ امرا کے لیے کتنی بڑی دنیا ہے۔ دیکھو تیرے ہاتھوں کتنے ہی لوگ دنیا میں بے بس ہیں۔

سلمیٰ ایک روایتی پشتون خاتون کی طرح اپنی قومی روایات ساتھ لے چلتی ہے۔ وہ حساس ہے۔ اپنی مثبت روایات کی شکست و ریخت کو برداشت نہیں کر سکتی۔ خودداری پشتونوں کی قومی فطرت ہے۔ اس میں ذرا بھی کمی نظر آئی تو بے ساختہ پکار اٹھی:

شاہین چې بہ د چا د عظمتونو گواہی کڑہ

آ سرونہ اوس ٹیٹیگی خو پہ ځ ے اوښکے اوری

ترجمہ: شاہین جن لوگوں کی عظمتوں کی گواہی دیتی تھی وہ سر آج جھک رہے ہیں اور میرے آنسو نکل رہے ہیں۔

پشتو کی ایک کہاوت ہے کہ "عورت گھر کی یا گور کی" مگر سلمیٰ نے اس کو غلط ثابت کیا ہے۔ وہ اس بات کو نہیں مانتی کہ موجودہ دور میں عورت گھر کی چار دیواری تک محدود رہے۔ اس کی بہتر تعلیم و تربیت ہو تو وہ معاشرے میں مردوں کے برابر اپنی صلاحیتوں کو منوا سکتی ہے۔ وہ کسی ایسی رسم کو نہیں مانتی جس سے عورتوں کے آگے بڑھنے کے راستے مسدود ہوں۔ ان کی نظموں

میں سماجی جبر کے خلاف للکار ہے۔ وہ منفی روایات سے بغاوت کرتی ہیں۔ ہر سماجی ناانصافی اور بغض و حسد کے خلاف انہوں نے لکھا۔ ان کی شاعری پیار و محبت کے مسحور کن نغمے بھی ہیں اور انقلابی للکار بھی۔ وہ اپنی ذات کے حوالے سے عورتوں کے حقوق کے لیے یوں آواز بلند کرتی ہیں:

وبه د ژوند د تسلسل رنګونه مه خایه ته
وبه احساس واخله ښکرا دا ژړا مه راکوه

ترجمہ: مجھے زندگی کے تسلسل کے رنگ مت دکھا۔ مجھے احساس اور ہنسی دے۔ آنسو مت دے۔

ان کی نظموں کی طرح ان کی غزلوں میں بھی معاشرتی طنز اور تنقید ہے۔ لوگوں کے رویوں پر تنقید ہے۔ حالات کی عکاسی ہے۔ جبر اور ظلم کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ ذیل کی غزل میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کی عکاسی کی گئی ہے:

زړګیه چپ شه په دے شور کے سوک خبره اوري
سه ہنګامه ده ظلم زور دے سوک خبره اوري
سوک د وفا په نوم لوټل کړي سوک د مینے په نوم
سوداګري ده په دے کور کے سوک خبره اوري
نه د پرده او نه د خپلو په تیجوتو پوے شو
سومره خیران دي زړونه تور دي سوک خبره اوري
حسن ارزان او دومره عام په دے بازار کښه نه ؤ
اوس ددے دور حالات تور دي سوک خبره اوري
شاهين بدل نه دے نظام لا د آقا او غلام
د وحشت تورژه ده بچه زور دے سوک خبره اوري

ترجمہ: اے دل چپ کر! اس شور میں کون بات سنتا ہے۔ اس ہنگامے اور ظلم و جبر میں کون بات سنتا ہے۔ کوئی وفا کے نام پر اور کوئی محبت کے نام پر

لوٹ رہا ہے۔ یہاں بیوپار ہو رہا ہے۔ اس گھر میں کون تیری بات سنے گا۔
اپنوں اور غیروں کی نیتوں کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ اکثر دل میلے اور کالے ہیں۔
اس بازار میں حسن اتنا سستا اور عام نہیں تھا۔ اب اس دور کے حالات کچھ
اور ہیں۔ شاہین ابھی آقا اور غلام والا دور نہیں بدلا۔ اس وقت کا زور دار تھپیڑ
ہے جس کی گونج میں کوئی بات نہیں سنتا۔

ایک نظم "ترزہ" (عورت) میں عورت کی سماجی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے کہ کیسے وہ بیٹی سے ماں بن کر خلق بنتی ہے۔ عورت کے مختلف روپ ہیں اور وہ اس کائنات کی خوبصورتی ہے لیکن آدم کی جابر اولاد کے چنگل میں ہے۔ وہ باپ بن کر اپنی بیٹی کو بیچتا ہے۔ بھائی کے جرم کے بدلے میں "سورہ" میں دی جاتی ہے۔ کبھی سر بازار نچوائی جاتی ہے۔ وہ ہمیشہ قربان ہوتی آئی ہے۔ یہ نظم عورت کے مختلف روپ کی کہانی ہے۔ اس کے تقدس کا بیان ہے۔ اس پر روا رکھے جانے والے مظالم کی کہانی ہے۔ ایک اور نظم "بلا" میں دہشت گردی کے حالات و واقعات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ لڑکیوں کے سکولوں کو جلایا جا رہا تھا۔ انہیں زبردستی برقعے پہنائے جا رہے تھے اور کوڑے مارے جا رہے تھے۔ سلمیٰ شاہین جہاں تیسری دنیا کی غربت زدہ خواتین کے لیے آواز اٹھا رہی تھی وہاں پختونخوا کی بچیوں کو پیش آنے والے ان حالات و واقعات پر بھی خاموش نہیں رہ سکی اور ذیل کی نظم کہی:

لا خو دے سترگے غړولے نه دے
لا خو پوره بیدارہ شوے نه دے
لا خو تعلیم د دے پوره شوے نه ؤ
تا خو ترا اوڑو نه لیدے نه وو
تکه هو ئی و شر ملا تو تحسید لے نه وو
لا خو دے گیډه مړه شوے نه وه
لا د پره دو لو خو وزلو د مه شوے نه دے
لے نیاز پیے ستا د ژوند د احترام او عزت
ارمان پوره شو نه ؤ

ابھی تیرا پیٹ کھانے سے نہیں بھرا تھا۔ پرائے برتن دھو کر ابھی آرام
نہیں کیا تھا۔ اے نازنین زندگی میں تیرے احترام اور عزت کا تیرا ارمان
ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ ابھی تیری مجبوری اور بے بسی ختم نہیں ہوئی تھی۔
ابھی تجھے کسی نے تیرے حقوق نہیں دیئے تھے۔ ابھی تیری آنکھوں سے
آنسو خشک نہیں ہوئے تھے۔ اوپر سے ایک اور بلا تجھ پر نازل ہوئی۔ کہتے
ہیں برقعہ پہنو اور اندھیرے میں زندگی گزارو۔ علم اور شعور کے راستے پر نہ
چلو۔ لیکن اے حوا کی بیٹی تیرے لیے کتنے پنجرے بنائے گئے۔ کتنی بیٹیاں
زندہ درگور کی گئیں۔ بہت سی جرم کے بدلے میں "سورہ" کی رسم کی بھینٹ
چڑھ گئیں۔ ہم کو بیچا بھی گیا ہے۔ ہم کو خریدا بھی گیا ہے۔ لیکن ہم شکست
نہیں مانیں گی۔ آؤ عہد کریں کہ اگر ہم اپنے دیس میں امن طلب کریں گی
تو ساتھ ہی مساوات اور اپنے حقوق بھی مانگیں گی۔ انصاف طلب کریں گی۔

سلمیٰ شاہین کی کچھ نظمیں طویل ہیں لیکن پر مفہوم اور پر تاثیر ہیں۔ ان میں سماج کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔ ان میں ایک پیغام ہے عورت پر ظلم کے خلاف صدائے احتجاج ہے۔ وہ پیغام دے رہی ہے کہ سماج عورت کو ایک انسان کے طور پر قبول کرے اور اس کو اس کا انسانی حق بھی دے۔ ایک نظم "خان او غریب" مکالماتی نظم ہے۔ اس میں خان کی رعونت اور غریب کا ملتجیانہ انداز ہے۔ غریب پر ظلم کی عکاسی کی گئی ہے۔ نظم "تخیل او زه او ته" (تخیل، میں اور تو) مزاحمتی افکار پر مبنی ہے۔ نظم "تیر خوبونه" (گزرے ہوئے خواب)
ایک طویل نظم ہے جس کا ایک حصہ یوں ہے:

خو به راشه خو به راشه
مروره ښکلا شه
دا موږ سومره دا ګډے شوے
لکه لیکه په اسمان کے
لکه کرښے
د احساس په بیابان کے

پہ اداکے دنیا کو لوزواتی تختے

تہ کہ مانہ گیر چو بیرہ

اوزبازوالی

ستا منگول کے د انگر دیو دانہ وہ

پہ یو سرد الاهو پہ سے تا ستر گے پٹو لے

پاکے ہینے تیکن وزرے فرشتے پہ راطلے

اس زمانہ مر دہ

پہ نشو دے زان نہ یو لم

د اقیصہ د حسر تونو

چہ اوگہ وشی ساوہ ے غیږی

ترجمہ: نیند آجا نیند آجا۔ ناراض ہو تو راضی ہو جاؤ۔ طویل عرصہ گزر گیا۔ جیسے آسمان میں لکیریں۔ جیسے احساس کے بیابان میں چیخیں۔ چیخ کریں۔ جب ہم جدا ہوئے۔ کتنا خوبصورت زمانہ تھا۔ کہو اے دوست تجھے یاد ہے۔ رنگین محبت کی آغوش۔ جب ہم ایک دوسرے کو قربان کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک دوسرے پر قربان جاتے تھے۔ جنت کی سی میٹھی یادیں۔ تخت پر سوتے تھے۔ پھول جیسے مسکراتے ہونٹ۔ خوبصورت بہاریں۔

(۲) ترجمہ: نیند آجا نیند آجا۔ ناراض ہو تو راضی ہو جاؤ۔ مجھے اس جہان لے جاؤ جہاں مجھے کوئی غم اور فکر نہ ہو۔ نہ آتشیں آہیں ہوں۔ نہ خیالوں پر زنجیروں کا بوجھ۔ ہم ہری پینگ کا دھواں ہو کر رہ گئے۔ یہ گل پری کے رخسار پر حسن کی بہاروں کی رنگینیاں چھا جاتی ہیں۔ وہ کیسی دنیا تھی۔ وہ کیسا زمانہ تھا۔ ناز و ادا میں جوانی گزر رہی تھی۔ تو مجھ سے لپٹا رہتا اور میری جوانی تیرے ہاتھ میں انگور کے ایک دانے کی سی تھی۔ میری ایک لوری سے تیری آنکھیں بند ہو جاتی تھیں۔ پاکیزہ محبت سفید پروں والی پریوں کو بلا لیتی تھی۔ اب مجھ سے روٹھ گئی ہو۔ اب نشہ آور دوا کھا کر تجھے اپنے پاس بلاتی ہوں۔

حسرتوں کا یہ قصہ جب طویل ہوتا ہے تو میرا دم گھٹتا ہے۔

سلمیٰ شاہین نے کئی نظموں میں ماضی کو پکارا ہے۔ بچپن، لڑکپن، جوانی اور ڈھلتی عمر کے احساسات و جذبات اور تجربات کو نظموں میں سمویا ہے۔ انہوں نے چار سو پھیلی زندگی سے شاعرانہ خیال لیے۔ اپنی قلبی واردات ور خارجی تصورات کو ہم آہنگ کر کے شعر کے روپ میں ڈھالا ہے۔ ان کے جذبوں میں سچائی ہے۔ انہوں نے جمالیاتی کیفیات کی کی بھی سچی تصویر کشی کی ہے اور معاشرے کی منفی روایات کو بھی پوری سچائی اور دیانت داری کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ کٹر پشتون شاعرہ ہے۔ ان کی شاعری میں بھی ان کی پشتونیت جھلکتی ہے۔ اپنے افکار کے اظہار میں کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوئی۔ وہ بچپن سے اپنی قوم کے جو حالات دیکھتی آئی ہے اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی چنانچہ اس کا برملا اظہار ایک غزل میں یوں کیا ہے:

ستا کہ د حسن آئینے بدلے نہ شوے

زما د مینے افسانے بدلے نہ شوے

ستا دے د ظلم لاس ازاد وی جبر قہر کوہ

زما سنگینے حوصلے بدلے نہ شوے

خوښه د خلقو په ما کاڼړی او کہ غشی اوری

وی پښتنے مے ارادے بدلے نہ شوے

ترجمہ: اگر تیرے حسن کے آئینے نہیں بدلے۔ میری محبت کے افسانے نہیں بدلے۔ تیرے ظلم کا ہاتھ آزاد رہے اور تُو جبر اور قہر کرتا رہے، میرے سنگین حوصلے نہیں بدلے۔ تُو گزرے اوقات کی روشنی یاد دلا کر مجھے نہ جلا۔ ابھی تک ہمارے گاؤں کی کالی راتیں نہیں بدلیں۔ یہ لوگوں کی مرضی کہ مجھ پہ پتھر برسائیں یا تیر برسائیں۔ میرے ارادے بھی پشتون ہیں اور بدلے نہیں ہیں۔

سلمیٰ شاہین نے آزاد نظمیں زیادہ کہی ہیں۔ آزاد نظم میں ان کی روشن فکری اور وسعت نظر ابھر کر سامنے آتی ہے۔ وہ عام فہم انداز میں اپنے شاعرانہ احساسات و جذبات کا اظہار کرتی

ہیں۔ اور اسی لیے ان کی شاعری میں صداقت اور فطری پن نمایاں ہے۔ ان کا شاعرانہ اسلوب فطری ہے۔ جب ان کے احساسات وجذبات کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے تو وہ لکھتی ہیں۔ اپنے احساسات وجذبات کے اظہار کے لیے وہ قافیے اور ردیف کو بھی خاطر میں نہیں لاتیں۔ ان کی شاعری میں روایت اور جدت یکجا نظر آتے ہیں۔ ان کے خیالات وافکار روایت کے قریب تر ہیں جب کہ اظہار کا اب ولہجہ جدید ہے۔ ماضی کو انہوں نے زیادہ یاد کیا ہے۔ وہ ماضی کو اپنی زندگی کا بہترین دور سمجھتی ہیں۔ حال سے وہ مطمئن نہیں ہیں۔ ان کی شاعری میں طنز اور تنقید بھی اپنے عہد کے انسانوں کے رویوں پر ہے۔ حال کی زندگی پر تنقید کرتے ہوئے ان کا اب ولہجہ تلخ ہو جاتا ہے جب کہ ماضی کو یاد کرتے ہوئے ان کے لہجے میں نرمی اور شیرینی کا احساس ہوتا ہے۔ ایک نظم "زہ لا ہغسے وړوکے" میں کہا ہے:

لکه اوس چې راته ګورې
داسے نه راته کتے
مور او پلار بہ خندیدلے
زه هم هغسے وړوکے

ترجمہ: جن نظروں سے اب مجھے دیکھتے ہو کاش ایسا نہ دیکھتے۔ میرے والدین مجھے دیکھ دیکھ کر ہنسا کرتے۔ کاش میں ویسی ہی چھوٹی ہوتی۔

نظم "تخیل" میں وہ کہیں دور خیالات کی وادی میں کھو جاتی ہیں اور ایک خوبصورت ماحول میں خوبصورت تلاش میں مگن رہتی ہیں۔

کله سپرلي کے د ګلونو په رنګ
کله وریځے وریدلو سره
کله په سوي کے د زړګي سے کتے
زه لکه شمع ژړیدم ورپسے
لکه پتنګ به سوزیدم ورپسے
ما دا اسمان بره هم او کتے
بیا ستورے ستورے شوم په فکر د ظلم

زہ به رڼا د کوه طور درکړم

لږ شوخي مستي سرور به درکړم

خو لا دے ګوتے دراوړلے نه وے

چه دے د زړه آئینے

ما ته د خپل وجود احساس راکړو

ترجمہ: کبھی بہار میں پھولوں کے رنگوں میں، کبھی شبنم پڑنے کے ساتھ اور کبھی دل کی سوزش میں تجھے ڈھونڈتی رہی۔ میں شمع جیسی تیرے لیے روتی رہی۔ پتنگ سی جلتی رہی۔ میں نے تجھے آسمان سے بھی پرے تلاش کیا۔ تھک ہار کر نیچے اتر آئی۔ میں ستاروں کے ساتھ روتی رہی۔ میں نے چاندنی کا نظارا بھی کیا۔ میں تیرے لیے سرگرداں پھرتی رہی۔ ہوا کی طرح ہر جھونکے کے ساتھ چلتی رہی۔ تیری امید میں ہر ہر راستے کو آسرا بنایا۔ میں نے اس رہ میں بہت سے پھولوں کو پتی پتی بکھیر دیا۔ میں نے دھوپ میں تیری خاطر اپنے پاؤں جلائے۔ میں نے بجلیوں کی شدت بھی دیکھی۔ میں ذرہ ذرہ کائنات میں بکھر چلی تھی۔ میں نے سوچا تم پھول ہو تو تجھے کھلانا پڑے گا۔ اگر پتھر ہو تو تجھے تراشنا پڑے گا۔ سوچتی کہ میری فکر کی حقیقت کیا ہو گی۔ آخر تجھے پا ہی لیا۔ میں نے آسمان سے تیرا جلال لیا۔ بہاروں سے جمال لیا۔ اپنے اشکوں کی شبنم سے تیری خوبصورتی بنائی۔ اپنے دل کے گھر میں تیرا گھروندا بنایا۔ میں خوشی کے اظہار کا ہنر نہیں جانتی تھی۔ میں کبھی میں نے تجھے سنبھال لیا ہے۔ اب تھوڑا دم لے لوں۔ اوقات سے شمار لے لوں۔ بہار سے کتنے رنگ لے لوں۔ اور تجھے خزاں سے کیسے چھپاؤں۔ میں تجھے کوہ طور کی روشنی دوں گی۔ تھوڑی شوخی مستی اور سرور دوں گی۔ لیکن ابھی انگلیوں نے تجھے چھوا نہیں تھا کہ تیرے دل کے آئینے نے مجھے اپنا احساس دلا دیا۔

ان کی شاعری کے موضوعات متنوع ہیں۔ انقلابی اور مزاحمتی افکار کے ساتھ ساتھ رومانی افکار بھی ان کے ہاں کثرت سے ملتے ہیں۔ پیار، محبت، خلوص اور وفا کے احساسات و جذبات کے ساتھ ساتھ طنز، درد، آہیں اور آنسو بھی ان کی نظموں میں ان کے افکار کے اظہار کے وسیلے ہیں۔ ایک نظم "آئیڈیل" میں رومانی افکار ملاحظہ ہوں:

ماله هم خوب شه راګو

دیشے

ماوے رازہ چے
دوے تخیل حسن احساس ور کڑم
دوے سپرلی سپرلی زوانی
ورتہ سہ داد ور کڑم
زہ ور نژدے شوم
ورتہ مے وے چہ اے
ہغہ د برق غوندے تیزئی کے
زما خوا کے تیر شو
مخ مے راواڑو
زڑگے مے ذوب غوندے شو
سترگے مے ڈکے شوے
زڑہ تہ مے واے راتگل
واے دا ہلکو یاران
د زلیخے زڑہ د خندرو راکو
خو تہ یوسف غوندے

ترجمہ: مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اس کی سیاہ آنکھیں خونی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ دوسرا یہ کہ اس کا حسن اور جوانی بھولنے والی نہ تھی۔ دل سے پوچھا اس کی کیا نسبت دوں۔ میں نے کہا زندگی کی صبحوں کی قسم۔ شاموں کی قسم۔ دمکتے تاروں اور راتوں کی قسم۔ سر شام ڈوبتے سورج کی قسم۔ تو اتنا حسین ہے کہ ان چیزوں میں تیری کوئی مثال نہیں ہے۔ اتنے خوبصورت ہو کہ تیری تعریف بجا طور پر نہیں کر سکتی۔ میں نے کہا کہ آ کہ تجھے محبت کا کوئی قصہ سناؤں۔ اس پر کوئی پابندی تو نہیں ہے۔ یہ دنیا محبت کے گلے کا پھندا تو نہیں ہے۔ پھر سوچا کہ یہ زمانہ جس کے ۲۰۰ سال کا کوئی شمار نہیں ہے۔ میری زبان محبت کے اظہار کی سرکشی نہیں مانتی۔ یہ میرا تخیل حسین ہے یا وہ حسین ہے۔ سوچا اسے اپنے حسن کا احساس دوں۔ اس کی بہار بہار جوانی کا اس کو داد دوں۔ میں نے قریب ہو کر اس کو مخاطب کیا تو وہ برق کی سی تیزی کے ساتھ میرے پاس سے گزر گیا۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ میرا دل

اے محبوب اے جانانہ

دا د سپارے انصاف دے

دا د کوم جرم سزا دہ

مانځو دے چہ پہ سفر ے

خپل منزل زان تہ نژدے کڑہ

دیوروں سحر پہ طمع

دیو ټل ماخام نہ وڑاندے

ھم رنگین ماز یګرے شتہ

چہ ئے زہ پہ تا پیرزو کڑم

او ما ھم خوب اشنا کڑے

دھغے بلے دنیا چہ دے تا پکے یون کڑے

او ما

تښتے د خوبونو خاپیروو شہزادګانو

زے قیصے دی اوریدلے

چہ سے زان خوا تہ نژدے کڑے

دھغے ماخام نہ وڑاندے

چہ او گدہ وشہ ور پسے دہ

ترجمہ: تم کہتے ہو یہ زندگی کی سہ پہر ہے۔ مگر سہ پہر اور شام تو باہم پیوست ہوتے ہیں۔ جیسے کہ تم اور میں ایک دوسرے کا سایہ ہیں۔ اس صحرا میں جہاں موت کے مقبرے میں کہیں بھی بلبل کے گیت سنائی نہیں دیتے مگر دور کہیں فضا میں ساحلوں سے پیاسی آوازیں اندھیرے میں سنائی دیتی ہیں۔ تم کہتے ہو یہ پیار کرنے کی کون سی عمر ہے۔ حسن کے وہ شعلے نہیں رہے اور جذبوں میں بھی ٹھنڈک ہے۔ آنکھوں میں وہ چمک باقی نہیں رہی۔ وہ حرارت و تمازت بھی مفقود ہے۔ جب میرے پاس حسن کی دنیا آباد تھی

تب تو کہاں تھی صبح سے دوپہر اور شام ہوئی اور سورج ڈھلنے کو ہے تب تم آئی ہو۔ میں کہتی ہوں میں تو پیار کی تلاش میں یہاں آئی ہوں۔ میرے ہاتھوں میں تھال ہے جو پیار، خلوص اور صداقت سے بھرا ہے۔ میں نے آرزوؤں، امیدوں اور ارمانوں کے اسپند جلا کر تم پر نچھاور کیے۔ اور جب دھواں چھٹا اور تمہیں پالیا تو تم کہتے ہو کہ شام ہونے کو ہے دھوپ ڈھلنے کو ہے۔ اے میرے محبوب یہ کیسا انصاف ہے۔ یہ کس جرم کی سزا ہے۔ میں تو سمجھ رہی تھی منزل قریب ہے۔ ایک روشن صبح کی امید میں ایک دوسری شام سے پہلے بھی ایک رنگین سہ پہر ہوتی ہے جسے میں تم پر نچھاور کر سکتی ہوں۔ تم جس جہاں کے ہو وہاں کے میں نے صرف شہزادوں اور پری زادوں کے قصے سنے ہیں۔ میں نے تمہیں خود کے قریب کیا اس شام سے پہلے جس کے بعد لمبی رات ہے۔

کتاب "پنزہ شمعے" (پانچ شمعیں) میں عبدالروف شاہ نے سلمیٰ شاہین کی شاعری پر اپنے تبصرے میں لکھا ہے " معنوی لحاظ سے شاعری کے دو ابعاد ہیں۔ تخیل اور تعقل یا رومانیت اور حقانیت۔ سلمیٰ شاہین کی شاعری میں رومانیت بھی ہے اور حقانیت بھی"

سلمیٰ کی شاعری فطرتی جذبات کا سادہ اظہار ہے۔ معاشرے میں اعلیٰ انسانی اقدار کی شکست و ریخت اور باہمی محبت و اخوت کے فقدان پر اس کا دل دکھتا ہے۔ حساس دل رکھنے کے باعث سماجی حالات و واقعات اس کے متاثر کرتے ہیں اور وہ اس کا اظہار اپنی نظم و غزل میں پوری سچائی سے کرتی ہیں۔ اس کی شاعری سے متعلق پروفیسر نواز طائر نے لکھا ہے:

"سلمیٰ پشتون معاشرے میں نئی نسل کی ایک فرد ہے جس کا ادبی ذوق زندہ ہے۔ وہ فکر احساس رکھتی ہے۔ دل میں وہ جذبات موجزن ہیں جو ہماری معاشرتی زندگی کے ہر اچھے اور برے پہلو پر تنقید کرتے ہیں۔ وہ اپنے لکھنے والوں کو جو پیغام دیتی ہیں اس میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو ایک حساس دل سے نکلی ہوئی بات میں ہوتی ہیں۔ ان کے شاعرانہ خیالات فکر کی دنیا میں جنم لیتے ہیں اور پشتون ماحول کے ساتھ مطابقت بھی رکھتے ہیں۔ وہ

غریب کی تعمیری رہنمائی کرتی ہیں اور افراد کی کمزوریوں اور ادھورے پن پر تنقید بھی کرتی نظر آتی ہے۔"

سلمٰی شاہین اپنے وطن میں مذہب کے نام پر قتل و غارت گری کی شدید مخالف ہیں۔ مذہبی منافرت پھیلا کر مخالفین کو کافر قرار دیا جاتا ہے۔ ان کا قتل تک واجب قرار دیا جاتا ہے۔ مذہب کے نام پر ملک میں افراتفری پھیلائی جا رہی ہے۔ عوام میں عدم استحکام پیدا ہو رہا ہے۔ امن تباہ ہو جاتا ہے۔ بیرونی تجارت اور سرمایہ کاری کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔ اس نقصان میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ ملک تو ان سب کا ہے۔ اس مذہبی منافرت کے علاوہ اسلام اور کفر کے نام پر جو جنگیں لڑی جا رہی ہیں اس سے بھی انسانیت پریشان و بے حال ہے۔ اس خیال کو انہوں نے یوں پیش کیا ہے:

نا خو جنگیږي د مذهب په نوم کافر مسلمان
انسانیت ټول په لړزان دے کالار حضے دے

ترجمہ: ابھی مذہب کے نام پر کافر اور مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں۔ پوری انسانیت تکلیف میں ہے اور ان کی فریادیں اسی طرح سنائی دے رہی ہیں۔

اسی غزل کے دوسرے شعر میں اظہار کی آزادی پر سوال اٹھایا گیا ہے کہ فکر اور قلم پر پابندیاں ہیں۔

رشتیا ویلے شي لیکلے شي دا هم اووایه
قلم او فکر بندیوان دے په دار ځنے دے

ترجمہ: یہ بھی بتاؤ کہ کیا سچ کہا جا سکتا ہے اور لکھا جا سکتا ہے یا فکر اور قلم ابھی مقید ہیں اور دار پر ہیں۔

سلمٰی شاہین نے جو سوچا سمجھا اور عزم کے ساتھ لکھا۔ جو دیکھا اور محسوس کیا اس کو نظم و نثر میں بیان بھی کیا۔ اپنے احساسات، محسوسات اور مشاہدات کی بیان میں وہ ذرا بھی ہچکچاہٹ کا شکار نہیں ہوئی۔ جو بھی دل میں تھا عزم کے ساتھ قلم کے سپرد کیا۔ مصلحتوں کا شکار نہیں ہوئی۔ ایک نظم "امبارکی" (مبارک باد) پشتو کے نامور شاعر اور سیاست دان اجمل خٹک کو پکارا ہے

سو مرہ چہ نگڑ وتہ دے اور ورتہ گڑو

چہ ٹیل محل تہ دے رڼا راوړہ

ترجمہ: میں سمجھ رہی تھی جوانی نہیں رہی تو میں تخلیق بھی نہیں کر سکتی۔ شاید میری سوچ کے چشمے سوکھ گئے ہیں۔ یا پھر جس حسن کی میں متلاشی تھی وہ نہیں رہے۔ جیسے میں عشق میں جرات اور اعتماد کو کھو دیا ہو۔ میرے الفاظ سوکھے ہوئے ہیں برستے نہیں ہیں۔ میں جو طوطی کی مانند بولتی رہتی تھی اب خاموش ہو گئی ہوں۔ مگر ایک شام جب مجھ پر تیری یادوں نے غلبہ پایا تو میں تیرے کردار پر سوچنے لگی۔ تم استعماروں کی قطار میں کھڑے ہونے کے لیے کن کن راستوں پر چل کر پہنچے ہو۔ یہ نظام جس میں خونخوار شخص دستار چھین لیتا ہے۔ یہ استحصالی نظام جس میں قوم کا سودا کرنے والے بھی فخر سے اپنے سر بلند کرتے ہیں۔ وہ دیوار جس کی بنیادوں میں لہو شامل ہو۔ ایسی وقت میں تم انصاف کی آنکھوں میں دھول کیسے جھونک سکتے ہو۔ ان ہی قارونوں اور فرعونوں کے وطن میں جو کنگال ہوں اور جن کے باطن صاف ہوں انہیں بے جا فخر و غرور کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی۔ تم مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ مگر میں تمہیں مبارک باد کیسے دوں کہ اپنے گھر میں روشنی لانے کے لیے تو نے کتنی جھونپڑیوں کو آگ لگا دی ہے۔

سلمیٰ شاہین کی شاعری پڑھنے کے لیے ذہنی یکسوئی چاہیے۔ بظاہر ان کی شاعری آسان اور سادہ سی لگتی ہے لیکن گہرائی میں جانے اور سمجھنے کی متقاضی ہے۔ ان کی سیاسی اور سماجی شعور بیدار بھی ہے اور بلندی پر بھی ہے۔ وہ سیاسی اور سماجی حالات و واقعات کا مشاہدہ بغور کرتی ہیں۔ اردگرد کے حالات ان کی تخلیقی قوت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وہ کسی بھی علاقائی اور سیاسی مصلحت سے بالاتر ہو کر انسانی حوالے سے اپنے افکار پیش کرتی ہیں۔ بے نظیر بھٹو شہید پر لکھی ہوئی ان کی نظم ان کے شعری مجموعے "انتخاب شاہین" میں شامل ہے۔ بے نظیر کی سیاسی جدوجہد اور خاص طور پر غریبوں اور مزدوروں کے لیے ان کے سیاسی عزائم کو شاعرہ نے یاد کر کے خراج تحسین پیش کیا ہے۔ نظم یوں ہے:

د عوام پہ مینہ مستہ د عوام پہ مینہ لاڑے

اوس عوام در پسے ژاڑی

د حوالو دے سہارہ وے

پہ تا گی دے اعتبار کڑو

سہ نیمگڑے نیمہ خوا دے زندگی وہ

عبادت د زندگی دے بندگی وہ

پہ یو چغہ د ژوندی جاے مکان

تا رو ٹول کڑل ٹول خواران غریبانان

پہ چغہ د مزدور دے میدان یوڑو

سہ جرات سہ حوصلہ سہ شخصیت

عقل فکر او دانش شعور ہمت

واڑہ تا باندے تمام وو

یوہ شمع درخشانہ پہ تیارہ کے

د مشرق او دے مغرب در تہ حیران دے

وادنیا بہ پیدا نہ کڑی بلہ تا غوندے زڑہ ورہ

یوہ تحرہ وفادارہ بے نظیرہ

ڈیر سڑی لہ تا نہ زار شہ بختورے

خور پہ سہ در تہ سوغات کڑم نہ پوہیگم

اوس بہ سوک د بیداری خبرے کاندی

اوس بہ سوک پہ تجل منشور باندے غاڑ گی

اوس بہ سوک پہ دے منشور راپورتہ کیگی

اوس بہ سوک د حرارت خبرے کاندی

ہر نظام چہ پہ بدلون کے

قربانی او وینہ غواڑی

ستا پہ شان بہ پیدا نہ کڑی

تہ بے شکہ بے نظیرہ وے

ترجمہ: عوام کی محبت میں مست عوام کی خاطر تو چلی گئی۔ عوام اب تیرے لیے رو رہے ہیں۔ اے

حوا کی بیٹی تو سادہ تھی کہ قاتل پر اعتبار کر لیا۔ تیری زندگی بھی کیا ادھوری زندگی تھی۔ تیری زندگی عبادت اور بندگی تھی۔ روٹی کپڑا اور مکان کے نعرے پر تو نے تمام مفلسوں اور غریبوں کو یکجا کر لیا تھا۔ مزدور کے حق میں ایک نعرے سے میدان مار لیا۔ تیری بھی کیا جرات تھی کیا حوصلہ اور کیا شخصیت تھی۔ عقل فکر دانش شعور اور ہمت تجھ میں بدرجہ اتم موجود تھے۔ اندھیروں میں شمع کی مانند تھی۔ اے مشرق کی بیٹی مغرب حیران ہے کہ اس دنیا میں کوئی دوسری بہادر بے نظیر پیدا نہیں ہو گی۔ بہت سے مرد تجھ پر قربان۔ سمجھ میں نہیں آتا تجھے تحفے میں کیا دوں۔ اب قوم کو بیدار کرنے کی باتیں کون کرے گا۔ اب کون اپنے منشور پر فخر کرے گا۔ اب کون لوگوں کی سسکیاں سن کر اٹھے گا۔ اب کون جوش و جذبے کی باتیں کرے گا۔ نظام جب تبدیل ہو گا اور قربانی اور لہو مانگے گا تو تیری جیسی کوئی پیدا نہیں ہو گی۔ بے شک تو بے نظیر تھی۔

سلمیٰ شاہین کی فکری صلاحیتیں اس کی آزاد نظموں میں کھل کر اظہار پاتی ہیں۔ ان نظموں کی خوبی یہ ہے کہ یہ سادہ اور عام فہم ہیں۔ انہوں نے فنی نزاکتوں میں وقت ضائع نہیں کیا۔ سیدھے سادے الفاظ میں اور عام فہم اسلوب میں اپنے افکار پیش کیے ہیں۔ شاعرانہ ترکیب سازی، تشبیہات و استعارات اور رمز و کنایے سے کلام کو لفظی سطح پر مزین کرنے کو ضروری خیال نہیں کیا۔ اپنے دل کی بات سادہ لب و لہجے میں قاری تک پہنچانے کی سعی کی ہے۔ ان کی شاعری میں مقصدیت ہے۔ زندگی کی کشمکش اور نظریاتی جدوجہد اس کی غزل اور نظم دونوں میں ایک غالب عنصر کے طور پر موجود ہے۔ شاعرانہ زبان صاف اور سلیس ہے۔ ایک صورت حال کی منظر کشی خوبصورتی سے کرتی ہیں۔ پشتو محاورے اور کہاوتوں کو برمحل استعمال کرتی ہیں۔ ان کے پہلے شعری مجموعے پر ڈاکٹر سید چراغ حسین شاہ نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> "شاہین کی نظموں اور غزلوں کے اشعار فکری شعور کی اساس پر مبنی اور پیار سے مربوط ہیں۔ ان کا تصور صاف ستھرا، سادہ اور پاکیزہ ہے۔ ذو معنی باتیں، رمز و ابہام اور ابہامی تصورات سے پاک ہیں۔ تجرید اور تمثیل کا فن ان میں کم ہے اور وہ نکس نہیں رکھتیں جس کے لیے نظم بدنام ہے۔ اعلیٰ فکر، نازک احساسات اور پاکیزہ جذبات رکھنے والی یہ دوشیزہ پشتون معاشرے کے منفی پہلوؤں پر تنقید کرتی ہے۔ شاہین وقت سے پہلے سنجیدہ

ہوگیں۔ مبالغہ آمیزی سے دور رہیں۔ بہت صاف ستھرا احساس رکھتی ہیں۔
غزل ایسے موڈ میں لکھتی ہیں کہ پر اثر اشعار پر مبنی ہو۔ اشعار میں جدت
ہے۔ رقیب کو بہت کم کوسا ہے۔ فنی تقاضوں پر پورا اترتی ہیں اور ان کی
شاعری مقصدیت کی حامل ہے۔"

زندگی کے حوالے سے سلمیٰ شاہین کہتی ہیں کہ زندگی کی تکمیل ممکن نہیں ہے۔ انسان
کبھی اس سے مطمئن نہیں رہتا۔ جیسے آپ بیری کھاتے ہیں تو کھاتے جاتے ہیں۔ کچھ کچی اور کچھ پکی
بیری منہ میں آتی ہیں۔ کچی کو آپ پھینکتے جاتے ہو۔ زندگی میں یہ دوڑ جاری رہتی ہے۔ سلمیٰ نے
اردو شاعر افتخار عارف کی ایک غزل کے زیر اثر غزل کہی ہے۔ افتخار عارف کی غزل کا ایک شعر ہے:

دیارِ نور میں تیرہ شبوں کا ساتھی ہو
کوئی تو ہو جو میری وحشتوں کا ساتھی ہو

سلمیٰ نے کہا ہے:

دا سوک دے چہ د درد دو دے ملگرے ھم وے
د سوی زڑہ د حسرتونو دے ملگرے ھم وے
زہ چہ شاہین یم حقہ ھم لکہ شاہین غوندے وے
د رنگو غرونو د سرونو دے ملگرے ھم وے

ترجمہ: کوئی ایسا ہوتا جو میرے درد کا ساتھی ہوتا۔ سوختہ دل کی حسرتوں کا ساتھی ہوتا۔ میں شاہین
ہوں تو وہ شاہین ہوتا اور اونچی چوٹیوں پر میرا ساتھی ہوتا۔

ان کی غزلوں اور نظموں کے موضوعات بھی متنوع ہیں اور مضمون کے لحاظ سے لب و
لہجہ بھی متنوع ہے۔ رومانی خیالات کو میٹھی زبان میں پیش کرتی ہیں جب کہ انقلابی اور حریت افکار
کو جوش و جذبے کے ساتھ بیان کرتی ہیں۔ کسی کی موت پر لکھتی ہیں تو رنج و الم کی کیفیت واضح ہوتی
ہے۔ مختلف موضوعات کی نظموں میں زبان و بیان کی کیفیتیں بھی مختلف ہوتی ہیں۔ نگین ولی خان
کی موت پر نوحہ، صاحبزادہ ادریس بابا پر نظم۔ یونیورسٹی کے ایک ساتھی ناصر جمال کی شادی کا سہرا
لکھا۔ زندگی سے متعلق خلیل جبران کے فلسفے سے ماخوذ نظم "دنیا" لکھی۔ انھوں نے اپنے شاعرانہ

خیالات کا اظہار آزادی سے کیا ہے۔ ذاتی زندگی میں بھی آزاد زندگی گزارتی ہیں۔ جیسے کہ کہا ہے:

زه په خپله مرضی ژوند کزم د گلونو ښار کے اوسم
ستا یادونه راوریگی د گلونو ښار کے اوسم
ستا په هجر سوزیدلے د تخلیق هنر ژوندے کړی
ستا په نکو کے تصور کزم د خوبونو ښار کے اوسم

ترجمہ: میں اپنی مرضی سے جیتی ہوں اور خوابوں کے شہر میں رہتی ہوں۔ جب تیری یادیں برستی ہیں تو لگتا ہے میں پھولوں کے شہر میں ہوں لیکن جب تیرے ہجر کی آگ جلتی ہے تو اس سے میری تخلیق کا ہنر نمو پاتا ہے۔ اور پھر میں فن کی دنیا میں رہتے ہوئے لفظوں سے تیری تصویریں بنتی ہوں۔ سلمیٰ کے فکر و فن کو ادیبوں نے سراہا ہے۔ پشتو شاعر رومان سافر نے ان ان کو جو منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ ایک کتاب "پنځه" شمعے (پانچ شمعیں) میں شامل ہے:

پښتنه جونه به ساه ازاده داخلی
د سلمیٰ د چم بدله که هوا شی
چه سلمیٰ نوے غزل د سحر راوست
د نوا په قافله کے شور غوغا شی
د اردو سلمیٰ فرضی وه او خیالی وه
د پښتو سلمیٰ د ورز غوندے رښتیا شوه
د سلمیٰ د مخ په آب به سافر ذکر شی
که ایشیا کے چرته زیاده پښتونخوا شی

ترجمہ: پشتون لڑکیوں کو آزادی مل جائے گی اگر سلمیٰ کی بستی کی ہوا بدل جائے۔ سلمیٰ نے صبح کی نئی غزل کہی تو آواز کی دنیا میں شور و غوغا ہو گیا۔ اردو کی سلمیٰ فرضی اور خیالی تھی جب کہ پشتو کی سلمیٰ روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ سلمیٰ کے چہرے کی خوبصورتی بڑھ جائے گی جب ایشیا میں پشتونخوا کو یاد کیا جائے گا۔

اتنا احترام کرتے ہیں کہ جب وہ راستے سے گزرتی ہیں اور وہاں بندوقیں چل رہی ہوں تو ان کے احترام میں فائر بندی ہو جاتی ہے۔۔ مجھے ہنسی آئی یہ فائر بندی احترام کی علامت ہے۔ مگر وہ تو ڈر کے مارے مصلحت کی زندگی گزارتی ہیں۔ وہ اگر جائیداد میں حصہ مانگتی ہیں یا زندگی اپنی پسند سے گزارنے کا اظہار کرتی ہیں پھر یہ نہیں دیکھتے کہ بندوق چل رہی ہے یا بند ہے۔ یہ نہیں دیکھتے عورت مر گئی ہے یا زندہ ہے۔ کیا یہ احترام ہے۔

عورت جس قوم اور جس سرزمین کی ہو اس کو سلمیٰ شاہین اپنی سمجھتی ہے۔ عورتوں پر ڈھائے جانے والے مظالم کو وہ برداشت نہیں کر سکتی۔ ان کا استحصال اس کے لیے ناقابل قبول ہے۔ عورتوں کے انسانی حقوق کو سلب کیا جائے یا ان پر جبر کیا جائے، ایسے واقعات ان کے دل و دماغ پر شدید اثر ڈالتے ہیں اور ان کا قلم جابر قوتوں کے خلاف لکھنے لگتا ہے۔ انہوں نے نظم و نثر میں جابر قوتوں کے خلاف کھل کر لکھا۔ ان کے مکروہ چہروں کے بے نقاب کیا۔ دراصل عزم اور جرات ان کی شخصیت کا حصہ ہے۔ زندگی بھر عزم و حوصلے کا ثبوت دیا۔ زندگی کے کسی موڑ پر متزلزل نہیں ہوئی۔ اپنے اصولوں پر سودے بازی نہیں کی۔ سچائی کے ساتھ دیا اور سچ پر قائم رہی۔ ۲۰۰۹ میں پشتو یونیورسٹی میں پشتو اکیڈمی اور پشتو ڈیپارٹمنٹ کو ایک مرکز میں ضم کر دینے کا نوٹیفکیشن جاری ہوا اور اس کو مرکز پشتو زبان و ادب کا نیا نام دیا گیا۔ پروفیسر ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک کو مرکز کا ڈائریکٹر مقرر کیا گیا۔ سلمیٰ شاہین جو اس وقت پشتو اکیڈمی کی ڈائریکٹر تھیں اس اقدام کو اپنے ذاتی خرچ پر عدالت میں چیلنج کیا۔ کیس دو سال تک عدالت میں زیر سماعت رہا اور آخر کار ۲۶ مئی ۲۰۱۱ کو فیصلہ پشتو اکیڈمی کو اپنی حالت میں بحال رکھنے کا ہوا۔ پشتو اکیڈمی اور پشتو ڈیپارٹمنٹ ایک بار پھر علیحدہ علیحدہ کام کرنے لگے۔ اس اقدام سے یونیورسٹی کے سترہ دیگر ادارے بھی متاثر ہوئے تھے مگر وہ خاموش تھے۔ صرف سلمیٰ شاہین نے ہمت کی۔ مقدمہ لڑا اور کامیاب ہوئیں اور دیگر اداروں کو بھی فائدہ ہوا۔ اس تگ و دو میں سلمیٰ شاہین کے کئی احباب کو ان کو تنہا چھوڑ دیا تھا اور خاموش تماشائی بنے رہے۔ اس کا شکوہ انہوں نے ایک نظم کی صورت میں کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ میں نے ایک موقف لیا اور اس پر کھڑی رہی تو میرے بعض دوستوں نے مجھ سے قطع تعلق کر لیا۔ وہ شاید ڈر رہے تھے۔ یہ نظم میں نے سنڈیکیٹ کے ایک ساتھی کے رویے پر لکھی تھی۔

زما محبوبہ اے جانانہ دومرہ مہ وریگہ

ته خو د فکر نه لوبغاړے نے ویرے یګے ولے

هر انقلاب هم د نه فکر نتیجه وی رازی

زما محبوبه اے جانانه دومره مه ویریګه

زه نه پوهیګم په ژاړه لا سوته نه راکوے

په دے غریم غربت د سرمایے مخے له نه شې ورتلے

ته خو زل په خپله پوهه اعتبار خو اوکه

یو زل خو دا الوزه یو وازے ټیل پرواز او ګوره

زما محبوبه اے جانانه دومره مه ویریګه

راځه راځه چه سره یو شو دا نظام بدل کړو

چے غریب تباه کوو راځه جهان بدل کړو

زما محبوبه اے جانانه دومره مه ویریګه

ترجمہ: میرے محبوب اتنا مت ڈرو۔ تم تو بہت اچھی سوچ رکھتے ہو ڈرتے کیوں ہو۔ ہر انقلاب کے پیچھے اچھی سوچ ہوتی ہے۔ میرے دوست اتنا مت ڈرو۔ مجھے معلوم ہے تم ٹھیک طرح سے ملتے نہیں ہو۔ یہ بھی جانتی ہوں کہ غربت سرمائے کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ تم ایک بار اپنی سوجھ بوجھ پر اعتبار تو کرو۔ ایک بار اکیلے اڑ کر اپنی پرواز تو دیکھو۔ میرے دوست اتنا مت ڈرو، آجا شیر بن جا اور گیدڑوں کا ساتھی نہ بن۔ میرے پیچھے آ اور دوسرے سہارے چھوڑ دے۔ آجا کہ ایک ہو کر اس نظام کو بدلیں۔ ایسے جہان کو بدل دیں جو غریب کو تباہ کر رہا ہے۔ میرے دوست اتنا مت ڈر۔ تم تو بہت اچھی سوچ رکھتے ہو ڈرتے کیوں ہو۔

سلمٰی شاہین پشتون روایات کی امین ہے۔ عزم و حوصلہ ہمیشہ اس کا بے معیار رہا ہے۔ اس کا پہلا شعری مجموعہ "نوے سحر" (نئی صبح) منظر عام پر آیا تو پروفیسر نواز طائر نے لکھا:

"یہ مختصر سی کتاب ایک پشتون لڑکی کے جذبات کی ترجمان ہے۔ ایک ایسی لڑکی جس کی تربیت پشتو ادب میں ہوئی۔ ان کی یہ پہلی کوشش آخری کوشش نہیں ہونی چاہیے کیونکہ زندگی کے ساتھ ساتھ تجربہ بڑھتا رہتا ہے۔ شاہین کی اس کتاب "نوے سحر" کا قدم آگے بڑھنا چاہیے اور اس کے بہت

سے سوز منظر عام پر آنے چاہئیں"

"نوے سحر" کے بعد انہوں نے ایک اور قدم آگے بڑھایا اور پھر یہ قدم آگے ہی آگے بڑھتے گئے۔ ان کا دوسرا شعری مجموعہ "زولا حتفے وڑووے" (میں اسی طرح گم سُن ہوتی)، تیسرا مجموعہ "راویل" اور چوتھا شعری مجموعہ "انتخاب شاہین" شائع ہوئے۔ ان کی نظموں کو ادبی تذکروں اور تنقیدی کتب میں شامل کیا گیا ہے۔ ایک نظم "د سحر رڼا" (صبح کی روشنی) کو ڈاکٹر عارف نسیم نے اپنی تنقیدی کتاب "ادبی تنقید" میں شامل کیا ہے۔ نظم یوں ہے:

ما دے سترگے پٹے کڑے
د سحر پہ انتظار وم
خو دا دومرہ اوگدہ شپہ وہ
چہ دے کلہ بہ صبا شی
چہ گلونہ بہ خندا شی
د مزدور د ارمانونو
د ستم تورو تیارو پہ
د سحر پہ رڼا مڑہ شی
دا بسر ئی رڼا کیگی
دا سحر نکاری بہ کیگی
سرہ گلونہ جوڑ خندیگی
ما دے زڑہ پہ سنگ ازاد شم
د قدرہ سزہ وہ خپلو
چا دے ورځ شہ اوبیدار شہ
تہ پوہ شوے پوا وازشہ
جمعیت شہ انقلاب شہ

ترجمہ: میں نے آنکھیں بند کیں اور صبح کا انتظار کرنے لگی۔ یہ لمبی رات تھی۔ میں سوچتی رہی کب صبح ہوگی اور پھول مسکرائیں گے۔ مزدور کے ارمانوں اور ستم کے اندھیرے صبح کی روشنی کے

آگے دم توڑ دیں گے۔ چنگاری بھڑکنے کو ہے۔ روشنی ہونے والی ہے۔ سرخ پھول مسکرانے کو ہیں۔ میں سوچ رہی تھی وقت کے گرم و سرد سے میں کیسے آزاد ہوں گی۔ کسی نے کہا بیدار ہو جا۔ ایک مٹھی بن کر ایک آواز ہو جا۔ جمعیت بن اور انقلاب بن جا۔

ان کی نظمیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ ترقی پسند سوچ کی شاعرہ ہیں۔ ایک عزم کے ساتھ پسماندہ طبقات کے لیے آواز اٹھا رہی ہیں۔ اس کی آواز میں توانائی ہے۔ عزم و حوصلہ ہے۔ وہ معاشرے کی ہر برائی کے خلاف قلم کا جہاد کرتی ہیں۔ وہ اپنی شاعری سے اس حوالے سے مطمئن ہیں کہ انہوں نے اپنا پیغام سماج تک پہنچایا۔ ان کی شاعری میں شوخی کی بجائے سنجیدگی ہے۔ وقار اور اعتماد ہے۔ اپنے کئی ہم عصروں میں اس حوالے سے منفرد ہیں کہ شاعری کے ساتھ ساتھ تحقیقی کام کو بھی آگے بڑھایا۔ اگر وہ ساری توجہ شاعری پر مرکوز رکھتیں تو پشتو نظم میں مزید اضافے کر لیتیں۔ انہوں نے شاعری میں اپنے جذبات کا برملا اظہار کیا ہے لیکن پشتو کے اخلاقی نظام کو پیش نظر رکھا ہے۔ شاعری اگرچہ مرد کی ہو یا عورت کی اس کو صنف کے امتیاز سے بالاتر ہو کر دیکھنا چاہیے لیکن اس کے باوجود خواتین کو جذبات کے اظہار میں بہت احتیاط برتنی پڑتی ہے۔ سلمیٰ نے وقار اور سنجیدگی کے ساتھ احساسات و جذبات کو نظم اور غزل میں ڈھالا ہے۔ پشتون روایات کی پاسداری بھی کی ہے اور جرات کا مظاہرہ بھی کیا ہے۔ اس کی شاعری میں درد ہے۔ وہ ایک درد مند دل رکھنے والی قوم پرست شاعرہ ہیں۔ اس کے رومانی افکار بھی حقیقی زندگی کی عکاس ہیں۔ اپنے ہاں کے معاشرتی حالات میں محبت کے اظہار کو ایک مجبوری اور ایک المیہ قرار دیتے ہوئے انہوں نے ایک نظم "یو تپوس" (ایک سوال) میں کہا ہے:

زمونگ څوک نه بچيږه دې مونګ پرے نه پوهيګو
مونګ که د يو بل سره مينه کوو
مونګ که په يو بل ترو شانګيو
خو ځکلے نه شو
يو د حياو غر په شاو لاړے
مانے ځم ځيلے لااوښروي
دا په سبب په رد حو توپاندے قلم کوم [illegible]

داسے ژوندون خوندے

لکہ بائیللے جوار گرپہ تش میدان گوری

یا سودائی پہ سودا پسے عمرونہ تیر کڑی

خو کلہ کلہ زڑہ دا راشی

چہ یو تپوس درنہ پخپلہ او کڑم

چہ پہ زوانو مو دوخت تو سیلو لوبے او کڑے

چہ مو پہ سترگو کے هم توان د نظر پاتے نہ شی

نو بیا بہ سہ وائیو یو بل تہ چہ اثار سہ دہ

او دا حیا دسہ دہ

ترجمہ: ہمارے غم بھی عجیب ہیں کہ ہم کو ان کی سمجھ ہی نہیں رہے جب ہم ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے لیے خوش ہوتے ہیں مگر اس کا اظہار نہیں کرسکتے۔ تو حیا کے پہاڑ کے پیچھے کھڑا ہے اور مجھے بھی اپنی اناز لا رہی ہے۔ یہ بے سبب روحوں پہ ظلم ڈھاتا یہ کوئی زندگی تو نہیں ہے۔ جیسے ہارا ہوا جواری خالی میدان کو گھور رہا ہو۔ یا ایک سودائی کسی سودے میں لمبی عمر گزار دے۔ کبھی کبھی میرے جی میں آتا ہے کہ میں خود ہی تجھ سے پوچھ لوں کہ جب ہماری جوانیوں پہ وقت کی ہوا نے خوب کھیل کھیلے اور آنکھوں میں بینائی تک باقی نہ رہی تو پھر ایک دوسرے سے کیا کہیں گے کہ اب انا کس بات کی اور حیا کیسی؟

مولانا ابو الکلام آزاد فرماتے ہیں شکاری جب پرندوں کو پکڑنے کے لیے جال بچھاتے ہیں تو اس میں دانے بھی ڈالتے ہیں۔ پرندہ دانہ چگنے کے لیے نزدیک گھومتا ہے مگر ڈر کے مارے زیادہ قریب نہیں جاتا مگر جو پرندہ دانوں پر پہلا حملہ کرتا ہے وہی انقلابی کہلاتا ہے۔ کیونکہ وہ دانہ وہ اپنے سر اور زندگی کے بدلے لے لیتا ہے۔ سلطی نے بھی شاعری میں ایک دانہ اٹھانے کی سعی کی ہے۔ اس کی شاعری میں انقلاب کی نوید بھی ہے اور لطیف انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی بھی۔ ان کی نظموں میں "حسن و عشق"، "زہ ورتہ سہ اووایم" اور "خوب" ان کی رومانی نظموں میں خوبصورت نظمیں ہیں۔

وہ اپنے ماحول اور معاشرے میں رونما ہونے والے حالات و واقعات پر بھی اپنا ردعمل

زوړ غمي زخمي کوتره

چې ستړی جوړ ته تیر دمه

ترجمہ: اے خونخوار میں تجھے آٹھ مارچ کو یاد کرتی ہوں۔ ذلیل کر کے یاد کرتی ہوں۔ میں یہی کہہ سکتی ہوں کہ تیری نظر میں عورت ایک گندا ٹشو پیپر ہے جو ڈسٹ بِن میں پھینکا جاتا ہے۔ تیرے لیے ماں، بہن، بیٹی کے رشتے کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔۔ تم بس ہوس کے مارے ہو۔ کوئی چھ سال کی ہو یا دس سال کی۔ ادھیڑ عمر ہو یا بوڑھی ہو۔ تجھے اپنے ہوس کے لیے مردہ بھی چاہیے۔ اے ناشکرے حیوان! میں عورت تیرے لیے ایک تحفہ ہوں۔ مگر بے بس اور مجبور ہوں۔ کبھی تو میرے پر کاٹ دیتا ہے۔ کبھی آگ میں جلاتا ہے۔ اے خون کے سوداگر! اے میری زندگی کے دشمن! تو ہر جرم سے بری الذمہ ہو کر سفید باز کی طرح اڑ سکتا ہے اور میں ایک زخمی کبوتر کی طرح سسکیاں لے لے کر زندگی گزارتی ہوں۔

****

باب سوم

سلمٰی شاہین کی نثر نگاری

سلمٰی شاہین کی پشتو اور اردو تصانیف میں ان کا اردو سفر نامہ "دل اور آنکھیں چین میں" اہم تصنیف ہے۔ وہ کئی ممالک کے ادبی دورے کر چکی ہیں۔ اکادمی ادبیات پاکستان کے چیئرمین افتخار عارف کی سربراہی میں ادبی وفد کے ہمراہ چین کے دورے پر گئی تھیں۔ دورے کے حالات و واقعات سفر نامے کی صنف میں کتاب کی صورت میں شائع کیے ہیں۔ کتاب کا انتساب یوں تحریر کیا ہے:

> "ان کے نام جو اپنے لوگوں سے محبت اور انصاف کرتے ہیں اور اپنی سرزمین پر امن سے رہنے کی ترغیب دیتے ہیں"۔

انتساب کے ان الفاظ سے واضح ہے کہ وہ چینی قوم کی محبت، انصاف اور امن سے متاثر ہوئی ہیں۔ اور اپنی محسوسات کو انتساب کے چند مختصر لفظوں میں خلوص سے ادا کر دیا ہے۔ انہوں نے یہ سفر نامہ ۲۰۰۳ میں لکھا۔ دورے میں انہوں نے چین کی ترقی اور قومی نظم و ضبط کو دیکھ کر جو کچھ محسوس کیا وہ سفر نامے میں تحریر کیا ہے۔ یہ سفر نامہ دو ملکوں کے عوام، حکومتوں اور ترقی کا تقابلی جائزہ بھی ہے۔ اپنے ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لیے عوام کے کردار کے ساتھ ساتھ حکومت کی کارکردگی اور اقدامات بھی نہایت ضروری ہوتے ہیں۔ سفر نامے میں اس حوالے سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ سفر نامے کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:

> "یہ بیجنگ شہر میں ہماری آخری رات تھی۔ تھوڑی ہی دیر پہلے تقریباً ساڑھے نو بجے ہم چین کے شنگھائی شہر سے بیجنگ پہنچ گئے تھے۔۔۔ ہمارا قیام پرائم ہوٹل میں تھا۔ جو شہر کے وسط میں واقع ہے۔ آج رات وطن واپس جانے کی خوشی، گزشتہ دنوں کی تھکن طبیعت کی بے قراری اور صبح کے انتظار نے سونے نہ دیا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بے چینی کی حالت میں اٹھی اور اس فائیو سٹار ہوٹل کے خوبصورت کمرے میں ٹہلنے

تھی۔ خود کو اکیلا محسوس کیا تو کھڑکی سے پردہ ہٹایا اور یونہی صوفے پر بیٹھ کر باہر دیکھنے لگی۔۔ اچانک خیال آیا کیوں نہ شہر کی اس رات کے آخری منظر کو قلم بند کر دوں۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ کتنا وقت گزر چکا تھا۔ ڈھائی بجے تھے۔ مجھے یقین نہ آیا کیونکہ لوگ چلتے پھرتے دکھائی دیئے۔ سڑک پر سائیکلیں اور بسیں چل رہی تھیں۔ اس خیال سے کہ شاید صبح ہو گئی، دوبارہ گھڑی پر نظر ڈالی۔ دو بج کر پچاس تھے۔ میں نے سوچا یہ لوگ سوتے نہیں اس لیے ان کی صبحیں ان کی اپنی ہوتی ہیں۔ اور شاید بہت روشن بھی۔ ہاں صبحیں ان کی ہوتی ہیں جو سوتے نہیں ہیں۔ ہاں خوشبوؤں اور روشنیوں کے سحر سے وہ قومیں سرشار ہوتی ہیں۔"

سلمیٰ شاہین نے چینی قوم کی انتھک محنت کو سراہا ہے۔ اور سخت محنت کو ہی ان کی ترقی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ اگر چین میں شاندار عمارتوں، پرشکوہ بزنس سنٹروں اور ترقی کے دیگر مناظر کو بیان کیا ہے تو اس قوم میں نظم و ضبط، وقت کی پابندی اور ہر کام میں حسن ترتیب کو بھی سراہا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ چینی لوگ بہت کام کرتے ہیں اور بہت مطمئن ہیں۔ ان کو اپنی مٹی سے پیار ہے۔ انہوں نے چینی ادیبوں کی خوش گفتاری کو بھی بیان کیا ہے۔ اور اپنے ادیبوں سے موازنہ بھی کیا ہے اور لکھا ہے:

"جب ہم شنگھائی ایئرپورٹ کے لیے بس میں سوار ہوئے تو ہمارے چینی دوست مسٹر نیور ہور مس ھو اور ان کا ڈرائیور پورے ڈھائی گھنٹے سے آس پاس سے بے خبر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ قہقہے لگا رہے تھے۔ اس وقت میں نے سوچا ان میں کتنی انڈر سٹینڈنگ ہے۔ تب میں نے ایک نظر اپنے ہم سفروں پر بھی ڈالی جو بے انتہا سنجیدگی اور خاموشی سے سفر کر رہے تھے۔ سفر کتنا مشکل اور تکلیف دہ ہوتا ہے چاہے زندگی کا ہو یا محبت کا۔ سنجیدگی، بدمزاجی اور خاموشی اس کو مزید مشکل بنا دیتی ہے۔ محبت ہمراہ نہ ہو تو اتنے مشکل مرحلے کس طرح طے کیے جا سکتے ہیں۔ اپنوں کی محبت ہی تڑپ کر لکھتی ہیں:

"یہاں زندگی کتنی حسین ہے۔ کتنی متحرک ہے۔ کھڑکی کے شیشے کے اور قریب ہوتے ہوئے میں نے نیچے دیکھنا شروع کیا۔ میں سوچتی رہی اور میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میں

کھڑکی سے ہٹ گئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ میں نے سوچا شاید یہ آنسو میرے لوگوں کے لیے ہیں۔ اگر صبح ہونے والی تھی تو میں رات بھر سوئی نہیں تھی۔ اور کسی لمحہ پر صبح کی پہلی کرن نمودار ہوئی اور اس کو بلب کی روشنی سمجھتے ہوئے دیکھنے لگی۔

سلمیٰ شاہین کو اپنے لوگوں کی غربت، بدحالی اور جہالت کا احساس اس وقت شدت سے ہوا جب اس نے چین میں عام لوگوں کی زندگی اور رہن سہن روشنیوں کی چکاچوند میں دیکھی۔ لکھا ہے:

''میرے لوگ غربت اور جہالت کی چکی میں پس کر مر گئے ہیں۔ میرے لوگ اچھی قیادت کے انتظار میں جمہوریت کے لیے تجربے کر کر کے تھک گئے ہیں۔ میرے لوگ بد دیانت اور کرپٹ سیاست دانوں کی وجہ سے عذاب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمارے لوگ بے حس اور بے ایمان ہیں۔ مجھے مسٹر ژیو کا جوشیلا نغمہ یاد آیا جو اس نے کل رات ہمارا اصرار کیے بغیر اپنے وطن کی محبت میں گایا تھا۔ وہ محبت، وہ جوش، وہ ولولہ اور عزم و استقلال وہ جذبہ وفا، یقین و محبت کا وہ شاندار اظہار جس میں چینی ادیبوں اور شاعروں نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔ وطن سے عشق ایسا ہوتا ہے۔ ہم ایسے کیوں نہیں۔ ہم اعتراض، بغض، طنز، تنقید، تعصب کو پروان چڑھاتے ہوئے کہاں پہنچنا چاہتے ہیں۔''

سلمیٰ نے ادب کے رشتے کو ایک قریب تر رشتہ سمجھا ہے۔ ہر زبان کا ادیب دوسرے کا ہم خیال ہوتا ہے۔ اور ایک دوسرے کو سمجھ سکتا ہے۔ طنز و مزاح، سنجیدگی کی ہر بات کو پرکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جملوں اور الفاظ کی معنویت اور مقصدیت کے ہر پہلو جاننے میں کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ سلمیٰ کے خیال میں ادیب اور شاعر جینیئس ہوتے ہیں۔ وہ معاشرے کے نبض شناس ہوتے ہیں۔ نڈر اور بے باک ہوتے ہیں۔ وہ زمانے سے پہلے پیدا ہوتے ہیں۔ وہ معاشرے میں پھیلی ہوئی برائیوں کو بے نقاب کرنے کی جرات کرتے ہیں۔ وہ بے انصافی کے خلاف لکھ اور بول سکتے ہیں۔ سلمیٰ شاہین لکھتی ہیں:

''میرے لیے اس وفد میں شریک ہونا فخر کی بات تھی۔ میرے ہم سفر وہ لوگ تھے جن کو معاشرے کی آنکھ اور دل سے تشبیہ دیتے ہیں۔ دل کی

آنکھیں، دل کی تمنا اور خواہشیں، آنکھوں کی محبت اور کشش کسی بھی انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہیں۔ مطلب یہ کہ ادیب اور شاعر چاہیں تو اپنی دھرتی پر انقلاب لا سکتے ہیں۔"

مجھے ژاں پال سارتر کے لیے اس دور کے فرانسیسی حکمران جنرل ڈیگال کی بات یاد آئی۔ جب سارتر کی شاعری اور مضامین کے خلاف حکومتی ایوانوں سے آوازیں بلند ہوئیں کہ سارتر کو جیل میں ڈال دو تو جنرل ڈیگال نے جواب دیا تھا کہ میں فرانس کو کیسے جیل میں ڈال سکتا ہوں۔ سارتر ایک آدمی کا نام نہیں وہ پورا فرانس ہے۔ میں پورے فرانس کو جیل میں نہیں قید کر سکتا۔

سلمیٰ اگر چینی معاشرے اور اپنے معاشرے کا تقابلی جائزہ لیتی ہیں تو اپنے لوگوں کے لیے جذباتی ہو جاتی ہیں۔ ان کو احساس ہونے لگتا ہے کہ قوموں کے بنانے میں سیاست دانوں اور حکمرانوں نے کتنا مخلصانہ کردار ادا کیا ہوتا ہے اور ہمارے ہاں اس شعبے کی کیا حالت ہے۔ غیر مخلص سیاست دانوں کے باعث ہمارا ملک اب تک غربت میں پھنسا ہوا ہے۔ غربت جہالت کو جنم دیتی ہے اور جہالت بے رہروی کو راستہ دینے میں دیر نہیں کرتی۔ بھوک پیاس انتہا کو پہنچ کر تباہی مچا دیتی ہے۔ جہاں غربت ہوتی ہے وہاں شعور اور آگہی کا کیا کام۔ وہ اپنے ملک کی تمام تر ناکامیوں اور پسماندگی کی بنیاد جہالت کو گردانتی ہیں۔ چین کی خواتین مردوں کے برابر کاموں میں حصہ لیتی ہیں۔ دکان، ہوٹل، مارکیٹ ہر جگہ عورت نظر آتی ہے۔ سلمیٰ کو یقین ہے کہ چین کی ترقی میں عورتوں کا برابر کا حصہ ہے۔

سلمیٰ نے چین کے سفر نامہ میں کئی حقیقتوں کو آشکارہ کیا ہے وہ جہاں بھی گئیں اس کی کہانی اپنے الفاظ میں بیان کی ہے وہ لکھتی ہیں۔ "۱۴ اگست کو ہم نے ماڈرن چائنیز لٹریچر میوزیم دیکھا۔ یہاں ہم نے جدید مصوری بھی دیکھی، انقلاب سے پہلے کے کئی پینٹنگز اور انقلاب کے بعد خوشحالی کا زمانہ، مختلف ادیبوں نے جس وقت جیسا اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ان کی تصاویر دیواروں پر بنی ہوئی تھی۔ مختلف شاعروں اور ادیبوں کے مجسمے بنے ہوئے تھے۔ وسیع و عریض رقبے پر لٹریچر کا عجائب گھر (عجائب خانہ) پھیلا ہوا تھا اس کے بعد Niux Mosque کو دیکھ کر ہم واپس آ گئے۔

محترمہ سلمیٰ شاہین کو چین کے ادیب بہت دلچسپ لگے اپنے سفر نامہ میں وہ اس حوالے سے لکھتی ہیں۔ "۱۵ اگست کو صبح دس بجے رائٹرز ہاؤس پہنچے دو سینئر اور دو جونیئر ادیبوں سے ملاقات

ہوئی سب ہمیں دیکھ کر خوشی سے ملے سنجیدگی سے گفتگو ہو رہی تھی۔ انہوں نے حکومت سے شاعری اور ادب پر اعزازات حاصل کیے تھے۔ محترم افتخار عارف صاحب نے پاکستانی ادب کے حوالے سے گفتگو کی اور چینی رائٹرز نے چینی ادب کے حوالے سے بات کی۔ پاکستانی ادب تاریخ اور تہذیب میں ٹیکسلا اور تخت بھائی کا ذکر ہوا۔ ادبی رجحانات۔ ماڈرن ٹرینڈز فکشن۔ ڈرامہ ہائیکو۔ شارٹ سٹوریز۔ اور ناول کے متعلق تبادلہ خیال ہوا۔ انہوں نے ہمارے چیئرمین صاحب سے سوال کیا کہ۔ پاکستان میں اتنی زبانیں بولی جاتی ہیں آپ ان کو یکجا کر کے کس طرح معیار کا اندازہ لگاتے ہیں؟ افتخار عارف صاحب نے جواب دیا کہ "ہم میں سے ہر کوئی انگریزی، اردو اور مادری زبان جانتا ہے ہم آسانی سے ترجمے کر سکتے ہیں۔ ہم نے ادبیات پاکستان میں "اکیڈمی اف لیٹرز" کے میگزین میں ان کو جگہ دی ہے۔ اس طرح سے ایک صوبے کا ادیب اور شاعر دوسرے صوبے کے ادیب اور شاعر کو پڑھ سکتا ہے۔

محترمہ سلمیٰ شاہین محبتوں کو سمجھتی اور محبت کرنے والوں کو جانتی ہیں ایک ساتھی نوجوان سعید کے بارے لکھتی ہیں۔

> "سعید زندہ دل نوجوان ہے محبت کرنے والا، انسانیت کا پاس رکھنے والا، اچھی شخصیت کا مالک ہے۔ اس کا ادبی ذوق اور شعر کہنے کا انداز اچھا لگا۔ رواداری اور محبت بندے کو دلچسپ بنا دیتی ہے۔ وہ بات کرنے کا انداز بھی جانتا ہے۔ اس رات بس میں، میں نے اس کو مخاطب ہو کر کہا "سعید آپ دوبارہ بھی شنگھائی آئینگے؟ اس نے کچھ نہ کہتے ہوئے مسکرا کر مجھے دیکھا اور بعد میں بیجنگ ایئرپورٹ پر کسی کی طرف اشارا کر کے جو کچھ کہا تو میں سمجھ گئی کہ میں نے اسے سچ بتایا تھا۔ یہ محبت بھی کیا ناقابل اعتبار شے ہے۔ ہونی نہیں چاہیے۔ کون چاہتا ہے اسے ہو جائے۔ کون چاہتا ہے کہ کرب و اذیت برداشت کرتا پھرے لیکن اگر ہو جائے تو بندے کو ولاسے کی ضرورت ہوتی ہے جستجو اور تڑپ کیا حسین امتزاج ہے جو زندگی کو متحرک رکھے ہوئے ہے
>
> اور کمال تک پہنچا کر دم لیتی ہے یا مرتی ہے یا مار ڈالتی ہے۔

محترمہ سلمیٰ شاہین منظر کشی کا ہنر خوب جانتی ہیں ہم ان کے سفر نامہ میں بہت سی چیزوں کو خیالات کے کینوس پر ان کی تحریروں میں دیکھ سکتے ہیں۔

اس سفر نامے پر مشہور شاعر و ادیب مرحوم ارباب یوسف رجا چشتی نے "گر قبول افتد" کے عنوان سے لکھا ہے اس سے ایک اقتباس "پچھلی صدی کے آخر میں کئی سفر نامے لکھے گئے اور اس صنف ادب کے کئی مصنف اپنا مقام سفر نامہ نگاروں کی صف میں متعین کرانے میں کامیاب ہوئے۔ سارے سفر نامے پڑھنا ہر کسی کے لیے شاید ممکن بھی نہیں۔ میں نے بھی بہت کم سفر نامے پڑھے ہیں۔ اب تک ان میں بے پناہ تاثر قائم کرنے والی تحریر ممتاز مفتی کی "لبیک" میں ملی جس کے ہر صفحے کے پڑھنے پر کئی کئی بار آنسو امڈ آئے ہیں بلکہ کئی بار محسوس ہوتا رہا کہ گلا رندھ گیا ہے۔ کچھ سفر نامے جغرافیہ اور تاریخ کی کتاب ہے کچھ رومان پرور لمحوں کی داستانیں کچھ وثیقہ عشق کردار جیسے وہ شگفتائی نائٹ ویو کی شام کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہیں "مجھے مسز یو کا جو شیلہ نغمہ یاد آیا جو اس نے کل رات ہمارے اصرار کے بغیر اپنے وطن کی محبت میں گایا تھا۔ اف وہ محبت وہ جوش وہ ولولہ و عزم، استقلال جذبہ و وفا، اور یقین و محبت کا وہ شاندار اظہار چینی ادیبوں اور شاعروں نے ان کا خوب ساتھ دیا۔ وہ گھن گرج اس کی آواز میں محبت کی جھنکار اور جذبے کی للکار، وطن سے عشق ایسا ہوتا ہے۔ اس کھلے اعتراف اور بھرپور تحسین کے بعد وہ باہر سے اندر کی طرف سفر شروع کر دیتی ہیں۔ یہ سفر خلاف معمول باہر کے سفر کی نسبت کٹھن کی بجائے تکلیف دہ زیادہ ہے۔ ان کی ہم آہنگی سے متاثر ہو کر اپنے وطن کی بے مائگی پر کڑھنا شروع کر دیتی ہیں اور کہتی ہیں "وطن سے عشق ایسا ہوتا ہے" اب بڑے عرصے کے بعد ایک سفر نامہ مختلف انداز میں کیفیات کا مخلصانہ اظہار لیے سامنے آیا ہے۔ یہ سفر نامہ ایک حساس دل کی کیفیات اور متفکر مفکرہ کے ذہن کی واضح ترین تصویر ہے۔ جو کہیں بھی Out of focus نہیں ہوتی۔ یہ ایک محب وطن کی سوچ کا آئینہ ہے۔ لیکن کیا یہ لفظ محب وطن مکمل طور پر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین کی فکر کی عکاسی کرتا ہے۔ چلیے میں کوشش کرتا ہوں کہ ان کے اسلوب کو کوئی نام دے سکوں تو یوں کہوں کہ انہیں اپنے وطن سے، اپنی دھرتی سے عشق ہے اور اگر عشق ہے تو دیوانگی کی حد تک۔ جذبات اور فکر کا یہ سفر جب ہی رواں دواں رہتا ہے جب ایک سچے قلم کی نوک سے شروع ہوئے۔ اس سفر نامے کی ہر سطر سے مصنفہ کی وطن پرستی۔ اپنی دھرتی سے عشق۔ اپنے معاشرے کی اقدار۔ ہر دکھ بلکہ شدید درد واضح

اور بلند آواز میں نظر آتا ہے۔

* ارباب یوسف رجا چشتی۔ ص۔ ۵۵۔

• دل اور آنکھیں چین میں

سلمیٰ ادب میں تقسیم کو نہیں مانتی۔ ان کا خیال ہے کہ ادب ادب ہوتا ہے چاہے مرد لکھے یا عورت۔ ان کے جذبات واحساسات یکساں ہوتے ہیں۔ ادب، تاریخ اور ماضی کے فلسفے سے چینیوں کا مضبوط رشتہ ہے۔ اقتصادی طور پر چین خوشحال ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ صحت، تعلیم خوراک اور رہن سہن پر چینی قوم خاص توجہ دیتی ہے۔ مرد اور خواتین سائیکل استعمال کرتے ہیں۔ شیر چینیوں کا علامتی نشان ہے جو شاید طاقت کی نشانی ہے۔ وہ طاقت کے بل بوتے پر پوری دنیا پر حکمرانی کرنا چاہتے ہیں۔ چینی قوم روایات میں زندہ رہتی ہے۔

سلمیٰ نے جب تھیٹر میں چینیوں کو تلوار چلاتے اور بادشاہوں کا ناچ کرتے دیکھا تو اسے اپنا روایتی خٹک رقص یاد آیا اور دو تہذیبوں میں اتنی مماثلت دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔ "دل اور آنکھیں چین میں" احساسات سے بھرپور تحریر ہے۔ یہ سفرنامہ ایک تہذیب کی واضح تصویر ہے۔ اس میں حالات وواقعات کے ساتھ ساتھ تجزیے بھی شامل ہیں۔ مصنفہ نے ہر شے کا موازنہ اپنے وطن سے کیا ہے۔ ان کے رہنماؤں کا اپنے رہنماؤں سے اور ان کی وطن پرستی اور جمہوری کردار کا موازنہ اپنے لیڈروں سے کیا ہے۔ ان کے فکر انگیز تجزیے پورے سفرنامے میں ملتے ہیں۔ اپنے معاشرے کی بے رہروی ان کو دکھی کر دیتی ہے۔ وہ جاگتے چین کی روشن صبحوں میں اپنے خوابیدہ معاشرے کو سوچ سوچ کر دکھی ہوتی ہیں۔ ان کی یہ صبحیں صرف صبحیں ہی نہیں روشن مستقبل کا استعارہ ہیں۔ ایک بیدار قوم جو پابندیٔ وقت، محنت اور لگن کی قائل ہے۔ اس سفرنامے کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ چین کی ترقی سے متاثر ہو کر اپنے لوگوں کے لیے بھی ایسی ہی ترقی اور خوشحالی کی آرزومند ہیں۔ یہ ایک سچے پاکستانی کے جذبات ہیں۔ اپنے ہم وطنوں سے محبت کے یہ جذبات ایک سچے قلم کار کے ہیں جس نے نثر اور نظم ہمیشہ اپنے لوگوں کی ترقی اور خوشحالی کی آرزو کے ساتھ لکھی۔

باب چہارم

سلمیٰ شاہین کا ناول

"کہ رنړا شوہ" (اگر روشنی ہو جائے) سلمیٰ شاہین کا پشتو ناول ہے جو ۲۰۱۰ میں شائع ہوا ہے۔ پشتو ثقافت کی بنیاد پر لکھا گیا یہ ناول ٹریجڈی سے بھرپور ہے۔ عائشہ اور رنړا (روشنی) ناول کے مرکزی کردار ہیں۔ یہ کردار زندگی کی تلخ حقیقتوں اور تجربات سے گزرتے ہیں۔ زندگی کی مشکلات میں گھری ہوئی ایک لڑکی پے در پے مشکلات سے نبرد آزما ہو کر کامیاب ہو جاتی ہے۔ محبت، عشق، شادی اور بے وفائی کے مختلف مراحل میں ایک مضبوط اور ناقابل تسخیر کردار بن جاتی ہے۔ جوانی میں غربت و افلاس اور جہالت کے خلاف لڑتی ہوئی اپنی منزل کو پالیتی ہے۔ وہ مقابلے اور عزم و ہمت کے جذبات اپنی بیٹی کو بھی ودیعت کر دیتی ہے۔ وہ خود زندگی کی بازی ہار دیتی ہے لیکن بیٹی کو ایسا اعتماد اور عزم بخشتی ہے کہ جو ایک عورت کی کامیابی کے لیے ضروری ہے۔ مصنفہ نے ناول میں معاشرتی حقیقتوں کا عکس خوب دکھایا ہے۔ اس ناول کا اردو ترجمہ نقیب احمد جان نے "اگر روشنی ہوتی تو" کے نام سے ۲۰۱۳ میں کیا ہے۔ مترجم نے اس ناول سے متعلق لکھا ہے:

"یہ چھوٹا سا ناولٹ زندگی کے ان بے رحم تجربات سے عبارت ہے جس میں عائشہ کی صورت میں ایک ایسا کردار جو محبتوں، چاہتوں اور توجہ کا حقدار ہونا چاہیے تھا۔ زندگی کے بے رحم ہاتھوں میں ایک ایسے پھول کی مانند ہے جس کی خوشبو اور رنگ سے سرور اور طراوت تو حاصل ہوتی ہے لیکن اس کی آبیاری، دیکھ بھال اور حفاظت پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ بلکہ جو لوگ اس کے رنگ و بو سے مستفید ہوتے ہیں وہی اس کے کچلنے کے سبب بنتے ہیں۔ ان ہی لوگوں کی بے توجہی اور تغافل سے اسے روندھا جاتا ہے۔ اس ناول میں تخلیق کی کار فرمائی بہت کم نظر آتی ہے۔ یہ کہانی زیادہ تر زندگی کے بے رحم تجربات سے عبارت ہے۔ میری نظر میں یہ واحد پلاٹ کی سادہ سی کہانی ہے۔ جس میں معاشرے کی اقدار، روایات اور کلچر کا عکس ہے۔ عورتوں کی محرومیوں، ان کے ساتھ معاشرے میں غیر منصفانہ سلوک اور ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا اٹھا کر بدلے میں کچھ نہ

دینے کا روادار دیا گیا ہے۔" عباس خان نے آج اپنے آپ کو اکیلا محسوس کیا۔ اس کی محبت، وفا اور خلوص کا ردوادار دیا۔ اپنے آپ کو مجرم سمجھا۔ روشنی نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی۔ اس نے خوب مقابلہ کیا اپنی سوچ اور اپنی مرضی سے اپنی زندگی کی ابتداء کی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی اپنی مرضی ان اندھیروں کی انتہا تھی۔ اس کی آزادی کا یہ قدم عائشہ کی تکلیف دہ زندگی کا نعم البدل تھا۔ اس نے اپنی روشنی خود پیدا کی۔ ان اندھیروں کو اس نے روشنیوں میں بدل دیا۔ جنھوں نے اس کی ماں کی زندگی کو ہڑپ کر لیا تھا۔ اب کسی عباس یا حسن کی اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ وہ خود مختار تھی۔ منزل صرف محرومیوں کا نام تو نہیں۔ اور بھی کئی راستے ہیں۔ یہ وہ راستہ نہیں تھا جس پر عائشہ ساری زندگی ہچکیاں لے لے کر روتی رہی۔ عائشہ اور روشنی میں فرق تھا روشنی اپنا حق چھین سکتی تھی۔ کیونکہ اب ظلمت کی رات ڈھل چکی تھی۔ اور روشن صبح کی ابتداء ہو رہی تھی۔ اس کا شریک حیات پاکستان میں انسانی حقوق کے کمیشن کا چیرمین تھا اور روشنی اس ادارے کی سرگرم رکن تھی ان کی زندگی کا مقصد انسانیت کی بھلائی، ہمدردی اور بہبود تھا۔

"کندہ زرتراشیدہ" ص۔ ۱۲۹

اس ناول کے بارے میں زر محمد ننگر نے اپنے پی ایچ ڈی مقالے میں لکھا ہے:

"یہ ناول معاشرتی اصلاح اور خصوصاً ورکنگ وومن کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس ناول میں پشتون کلچر کو دکھایا گیا ہے۔ یہ ایک ٹریجڈی ناول ہے۔ جس میں عائشہ اور روشنی کے کردار اہم ہیں۔ زندگی اور حالات کے اندھیروں میں روشنی کا کردار ایک روشنی پھیلاتی ہوئی، مقابلہ کرتی ہوئی روشنی کی علامت اور خوشخبری ہے۔ یہ ناول شعوری طور پر لکھا گیا ہے۔ یہ ایک سبق آموز کہانی ہے۔ ایک باشعور لکھاری جو اپنے ارد گرد معاشرے میں جو کچھ دیکھتا ہے اس پر قلم اٹھانے کی جرات کرتا ہے۔ کیونکہ خیال، قلم اور تعلیم پر کوئی پابندی نہیں۔ یہ پابندی ہم نے خود پیدا کر کے لگائی ہے۔ ناول عائشہ کے کردار سے شروع ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کئی مشکلات سے گزرتی ہے۔ اور آخر میں مصنفہ یہ دکھاتی ہے کہ اگر ایک لڑکی کو کوئی مسئلہ درپیش ہو تو وہ انسانی حقوق کے کمیشن سے رابطہ کر کے اس کو حل کروا سکتی ہے۔ عائشہ

اور روشنی میں یہی فرق تھا۔ ان کی زندگی کا مقصد انسانیت کی رہنمائی اور مدد
ہوتی ہے۔ اس لیے سلمٰی نے پوری زندگی خواتین کے ساتھ ہمدردی اور
رہنمائی میں گزاری"۔

باب پنجم

سلمیٰ شاہین کے افسانے

سلمیٰ شاہین کے افسانوں کا مجموعہ "کاڼړي او اغزي" (پتھر اور کانٹے) ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۱۷ افسانے اور تین انشائیے ہیں۔ افسانوں کے بیشتر موضوعات عورتوں کی معاشرتی پابندیوں، غربت، بے بسی اور عورتوں پر مظالم کے ہیں۔ انھوں نے ہر اس رویے پر تنقید کی ہے جو انسانوں کے بے بس، کمزور اور مجبور بناتا ہے۔ سرمایہ داری کے چنگل میں پھنسی ہوئی مخلوق پر ان کی گہری نظر ہے۔ وہ نظام کو بدلنے کی خواہاں ہیں۔ "کاڼړي او اغزي" کتاب کا نا مکمل افسانہ ہے۔ اس میں بی بی گل کی اپنی چھوٹی نوکرانی شیرین کے ساتھ سلوک اور شیرین کے ساتھ اپنے والدین کا برا سلوک دکھایا گیا ہے جو بیٹی کو کھانے کو کچھ نہیں دیتے۔ شیرین غربت اور جہالت کی ماری بھوکی ننگی بچی ہے۔ ایک امیر خاندان میں نوکری پر لگ جاتی ہے۔ جہاں وہ ایک نئی زندگی کی ابتدا کرتی ہے۔ وہ اس بڑے گھر کی مالکن بن کر زندگی بسر کرتی ہے۔ اس کی مالکن شوہر کی محبت میں کمی نہیں لانا چاہتی اور اسی لیے بچہ پیدا نہیں کرتی۔ جب اس کا خاوند مر جاتا ہے اور وہ بیوہ ہو کر اکیلی رہ جاتی ہے تب وہ اپنی نوکرانی کے بچے کو دل ہی دل میں اپنا بچہ مان لیتی ہے۔ وہ جب گہوارے میں پڑے بچے کے پاؤں میں جو تا دیکھتی ہے تو تب اس کو اپنے بچپن اور اپنے ننگے پیر اور پیروں میں چبھے ہوئے کانٹے یاد آ جاتے ہیں۔ وہ بچے کو گود میں لینے کے لیے تڑپ اٹھتی ہے۔ اور اسے یہ احساس طمانیت دیتا ہے کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔ اس کی گود میں اس کا وارث موجود ہے۔ کہانی پر افسانہ نگار کی گرفت مضبوط ہے۔ غربت سے امارت تک کا یہ سفر دل کو چھو لینے والا ہے۔

ان کے دو افسانے "گلونہ" (پھول) اور "ڈمہ" (رقاصہ) میں عورت کے دو مختلف روپ اور مختلف کردار دکھائے گئے ہیں۔ گلونہ ایک خاتون لکھاری کی کہانی ہے۔ اور ڈمہ ایک رقاصہ کی زندگی کا عکس ہے۔ اگرچہ دونوں کہانیوں میں تصور مختلف ہے مگر درد و کرب، قلبی کیفیت اور جذبوں کے رنگ یکساں ہیں۔ دونوں کہانیوں میں اس سماج میں عورت پر ہونے والے،

مظالم کی عکاسی کی گئی ہے۔

"د سرو پنجرہ" (سونے کا پنجرہ) یہ انقلابی سوچ پر مبنی ایک مزاحمتی کہانی ہے۔ ظلم و بربریت، انسانی حقوق کی پامالی اور سماجی ناانصافی کی شکار خواتین کے المیوں پر مبنی کہانی ہے۔ اس کہانی کا آخری حصہ اس کی مقصدیت کو نمایاں کرتا ہے جو یوں ہے: "انسان جذبات و احساسات بھی رکھتا ہے۔ لکڑی اور لوہا تو مادی دنیا کی چیزیں ہیں۔ اور میں تو پھر ایک عورت ہوں۔ سونے کا پنجرہ ایک اچھے ساتھی کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ اس پنجرے میں باقی پرندوں کا شور بھی بہت ضروری ہے۔ تنہائی تو انسان کو آہستہ آہستہ مار دیتی ہے۔ اب تو میں مر گئی ہوں اور مجھے خیال آیا کہ یہ مرے ہوؤں کو پنجرے سے کیسے نکالتے ہیں؟ اس کا احساس، اس کی ادھوری زندگی کا ادھورا ارمان، بے وقت موت نے اس کو پنجرے میں دفن کیا تھا۔ اس نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے کہا: "یہ پنجرے بیٹوں کے لیے نہیں کھلتے۔ کیونکہ بیٹیں احساسات و جذبات نہیں ہوا کرتے رکھتی ہیں۔ مگر بیٹیاں سونے کے پنجرے کھولنے کا ہنر جانتی ہیں۔"

افسانہ "آبادی" کمزور معیشت کے برے اثرات کی عکاسی ہے۔ انسانی زندگی میں بھوک، افلاس، طبقاتی تقسیم اور امتیازی سماجی سلوک پر افسانہ نگار نے طنز کے تیر چلائے ہیں۔ ایک اور افسانہ "سوداگرہ" ایک خاتون افسر کی کہانی ہے جو ہر کسی کے ساتھ پیار، شفقت اور سادگی سے پیش آتی ہے۔ مگر ساتھ کام کرنے والے اس کی نرمی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بات وہ جانتی ہے مگر اس کا اظہار نہیں کرتی۔ جب ایک افسر ایک فائل اس کے سامنے رکھتا ہے تو تو وہ ایک خط اس کے سامنے رکھ دیتی ہے۔ جس میں اس کے دوست نے مریم سے اس کی دھوکہ دہی کی پوری داستان لکھی ہے۔ وہ دونوں مریم کو اپنی ترقی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ وہ تو کرب سے گزرتی ہی ہے لیکن سامنے والے کی ملامت بیان سے باہر ہوتی ہے۔

دو اور افسانے "ایرے" (راکھ) اور "کتاب" بھی بامقصد افسانے ہیں۔ ایرے میں خون کے رشتوں کے مابین دشمنی کی نذر ہونے والی محبتوں کی کہانی ہے جو ذاتی دشمنی میں جل کر

راکھ ہو جاتی ہے۔ افسانہ "کتاب" میں کتابوں سے عشق کرنے والوں کو حقیقی زندگی سے الگ خیال کیا گیا ہے۔ افسانہ نگار نے لکھا ہے: "آج میں نے تمام کتابوں کو آگ لگا دی۔ اب میں کتابوں کے سحر سے نکل گئی ہوں۔ مجھے حقیقی دنیا میں جینا ہے۔ یہاں بس ایک ارمان دل میں ابھرتا ہے کہ کاش میں ایک کتاب ہوتی اور کوئی مجھے پڑھنا چاہے وہ ادھوری ہی کیوں نہ ہوتی۔" "شاہکار" اور "زنجیر" نام کے دو افسانے بھی زندگی کی حقیقتوں کی تصویریں ہیں۔ افسانہ زنجیر میں عورت اپنے اندر کی عورت کی تکمیل کے لیے محبوب کی تلاش میں سرگرداں ہوتی ہے۔ اگرچہ وہ شادی شدہ ہوتی ہے۔ وہ اسی تڑپ میں اپنے محبوب کو پا لیتی ہے۔ اس کے گلے کی زنجیری اس کے خاوند کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔ مگر اسے کوئی ڈر نہیں لگتا۔ وہ مطمئن سی اپنے پیار کے لمس میں کھوئی رہتی ہے۔ جیسے اس کا ادھورا پن مکمل ہو گیا ہو۔ افسانہ "تور" میں ایک زخم خوردہ عورت کی مسلسل جدوجہد کو موضوع بنایا گیا ہے۔

سلمیٰ شاہین نے اپنے افسانوی مجموعے میں انشائیے بھی شامل کیے ہیں۔ انشائیہ کو پشتو میں "ٹکل" کا نام دیا گیا ہے۔ ان کے انشائیوں کے نام یہ ہیں: شرمخ (بھیڑیا)، پشکالی چینجے (برساتی کیڑا) اور "سپی" (کتے)۔ ان تینوں انشائیوں کا انداز بیاں خوبصورت اور پس منظر معنی خیز ہے۔ شرمخ میں بھیڑیے کو جنگل میں دکھانے کے بجائے معاشرے میں دکھایا گیا ہے کہ کیسے ایک انسان بھیڑیے کی شکل میں عورتوں کا شکار کرتا ہے۔ انسانوں کے معاشرے میں پائے جانے والے یہ بھیڑیے بانو قدسیہ کے "راجہ گدھ" کی طرح ہیں جس سے عورتوں کو خطرہ ہوتا ہے۔ اسی تناظر میں انشائیہ "سپی" بھی لکھا گیا ہے۔ اس معاشرے میں عورتوں کے لیے بکھری ہوئی وحشتوں، غلاظتوں اور خوف کو بنیاد بنایا گیا ہے۔ اکثر عورتیں روایات و اقدار کی جنگل میں پھنسی ہوتی ہیں۔ مردوں کا حرص و ہوس ان کو جینے نہیں دیتا۔ عورت خود کو بچانے کی تگ و دو میں رہتی ہے۔ وہ وحشت کے سائے میں یہی سوچ کر زندگی گزارتی ہے کہ وہ کتوں میں گھری ہوئی ہے۔ اور وہ کسی بھی وقت اس کو کاٹ کھائیں گے۔ انشائیہ "پشکالی چینجے" میں بے وقت ابھرنے والے ہر دور کے ان شاعروں اور ادیبوں کو موضوع بنایا گیا ہے جو ساون کے کیڑوں کی طرح ابھر آتے ہیں اور جلد ختم بھی ہو جاتے ہیں۔ پروفیسر اسیر منگل نے اپنی تصنیف "پشتو افسانے کے سو سال" میں سلمیٰ شاہین کے افسانوں کے حوالے سے لکھا ہے:

"سلمیٰ شاہین پشتو ادب میں خواتین لکھاریوں کے حوالے سے زیتون بانو کے بعد جانا پہچانا نام ہے۔ وہ نہ صرف شعر کہتی ہیں بلکہ افسانے اور انشائیے بھی لکھتی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "کاغذی اوراق" ۲۰۰۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ان کے افسانوں کو بنیادی مقصد سماج کو یہ شعور دینا ہے کہ وہ اپنی بیٹوں بیٹیوں کے بارے میں جدید رجحانات کے تناظر میں فیصلہ کریں۔ ان کے کئی افسانے بہت اچھے ہیں جن میں ٹائیٹل افسانہ "کاغذی اوراق"، "گل رخ"، "دسرو پنجرہ"، "گلونہ" اور کئی دیگر افسانے قابل ذکر ہیں۔ ایک افسانے "ڈمہ" میں نابالغ لڑکی اور لڑکے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ یہ دونوں بچے رقص و سرود کے شوقین ہوتے ہیں اور موسیقی کی ہر محفل میں شریک ہوتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو چاہتے بھی ہیں۔ لیکن جب طوائف مردوں کے بیچ میں رقص کرتی ہے تو اس کے غیر اخلاقی اثرات بچے ذہنوں پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ افسانہ "آئیڈیل" میں نوجوان لڑکیوں کو یہ مشورہ دیا گیا گیا ہے کہ وہ آئیڈیل تلاش کرنے میں کسی عجلت کا مظاہرہ نہ کریں۔ سلمیٰ شاہین افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ انشائیہ نگار بھی ہیں۔ جس کی جھلک ان کے افسانے میں بھی ملتی ہے۔ وہ افسانے کی فنی نزاکتوں سے خوب واقف ہیں تاہم کبھی کبھی واقعات کو آگے بڑھانے میں ان کی فنی گرفت اس لیے سست پڑ جاتی ہے کہ فن پر جذبہ غالب آ جاتا ہے۔ ان کے موضوعات جدید ہیں جن میں معاشرے کے نہ صرف تعلیم یافتہ خواتین کی محرومیوں کا تذکرہ ملتا ہے بلکہ نچلے طبقے کی بے بس لڑکیوں کے المیے بھی اجاگر کیے گئے ہیں۔"

سال 2005 مجلہ "پشتو" میں محترمہ سلمیٰ شاہین کا ایک افسانہ "پورٹریٹ" شائع ہوا اس افسانے کا ترجمہ یہاں شامل کر رہی ہوں۔

"پورٹریٹ"

مجھے تمہارا خاکہ بنانا ہے۔ یہ میری خواہش تھی اور ارمان بھی اور تمہارا خاکہ بنانا بھی

ضروری تھا کیونکہ پچھلے کئی سال سے میری آنکھوں نے تمہارے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ اور کئی سال سے میں نے تمہارے علاوہ کسی کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ تمہارا حق تھا کہ میں اپنے قلم سے تمہارا خاکہ بناؤں۔ تم سے پیار کے اظہار کا میرے پاس یہ ایک واحد ذریعہ ہے۔ کہ میں تمہیں بہت خوبصورت بناؤں۔ اتنی عمر گزر جانے پر میں تیرے تصور کے دائرے سے نہیں نکلی۔ مجھے علم نہیں تھا اور سمجھ بھی نہیں تھی کہ میں تمہارا خاکہ اتنا خوبصورت کیوں بنانا چاہتی ہوں۔ ایسا کرنے سے میں کس سے خود کو منوانا چاہتی ہوں یا یہ چاہتی ہوں کہ تمہیں لوگ جانیں یا میں تمہیں لوگوں کو دکھانا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی تھی کہ تمہارا خاکہ بناؤں مگر اس وقت میں خود کو تمہارے برابر کا نہیں سمجھتی تھی۔ تم مجھے بہت بڑے، بہت خوبصورت اور بہت اچھے لگتے تھے۔ اور میں تمہارے اس معیار کی نہیں تھی۔ میرے خیال میں مجھے تمہارا خاکہ بنانے کے لیے ابھی انتظار کرنا تھا۔ اتنا کہ جہاں تم تھے مجھے بھی وہیں تک پہنچنا تھا۔ اور اب جب میں بہت تھک گئی تھی۔ میں نے کہا بس اتنا انتظار، تکلیف، محنت، اور سوچ کافی تھی۔ میں نے اتنی فکر کبھی کسی دوسرے خاکے کے لیے نہیں کی تھی مگر یہ میری آخری پورٹریٹ تھی۔ میری رنگوں کا انتخاب اتنا برا تو نہیں۔ اور اب جب میری نظر تیز ہونے لگی میری فکر بالغ ہو گئی۔ جب مجھے یقین ہو گیا کہ میں تمہیں اب بنا سکتی ہوں تو اب خاکہ نہیں بن سکتا تو میں کیا کروں؟ شاید میں اس کا آسمان بنانا چاہتی ہوں اور تم زمین پر آرہے ہو۔ مگر اب میں بہت دور جا چکی ہوں کیونکہ ہر کوئی اس ہنر کو نہیں سمجھتا اور خاکے بھی ہر کسی کے نہیں بنتے۔

"سلمی شاہین۔ سال ۲۰۰۵ مجلہ "پشتو"

"ماں" پر محترمہ سلمی شاہین نے یہ انشائیہ لکھا جو ان کی کتاب میں شامل ہے۔

ماں تمہارے نام پر گاؤں آباد کیا۔ تمہارے نام پر کئی گھر ہیں۔ تمہارے نام پر سینکڑوں سکول اور کالج بنائے۔ میں بہت دور اندیش ہوں۔ میں چاہتا ہوں تمہارا نام زندہ رہے۔ دنیا کی افراتفری میں تم گم نہ ہو جاؤ ماں کیونکہ تمہارے پیار اور خلوص پر میرا حق تھا۔ تمہاری ہمت، برکت، حوصلہ اور محنت میرے لیے تھی۔ اور جب میں بڑا آدمی بنا۔ بنگلوں اور موٹر کاروں، باغوں اور دولت کا مالک بنا تو ماں اس وقت میرے گھر میں تمہارے لیے سرونٹ کوارٹر بھی نہیں تھا۔ میں جب تمہیں دیکھتا تھا تو میں ڈپریشن میں چلا جاتا تھا کیونکہ میں سیلف میڈ تھا۔

میری دولت میرے بچوں کے لیے تھی۔ تمھاری محبت اور تمھارا خلوص بے شک میرے لیے تھا مگر میرے جائداد پر میرے بچوں کا حق تھا۔ مجھے اچھی زندگی چاہیے کیونکہ میں سیلف میڈ ہوں۔ ماں مجھے یقین ہے کہ میں جو کہتا ہوں یہی حقیقت ہے۔ اور تم مجھے ضرور معاف کرو گی۔ کیونکہ معاف کرنا تمھاری عادت ہے اور میری عادت جیتے جی تمھیں مار دیتا ہے۔

"کاغذی اوراق"

یہاں میں افسانہ کاغذی اوراق سے ایک اقتباس شامل کرنا چاہتی ہوں۔

"میں ناشتے کی میز تک آگئی۔ شیریں اب بھی جواب کی منتظر تھی میں نے میز پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ اس کے باوجود کہ میں شوگر۔ بلڈ پریشر۔ اور گردوں کی مریض ہوں۔ میری عمر پچپن سال ہے مگر چاہتی ہوں کہ ناشتے کی میز پر مکھن، جیم، آملیٹ، شہد اور جوس سب موجود ہوں۔ میں ان تمام چیزوں میں سے کچھ نہیں کھاتی۔ کیونکہ مجھے یہ سب چیزیں کھانے کی ممانعت ہے۔ شیریں بھی حیران ہوتی ہے کہ جب یہ کھاتی نہیں ہے تو؟۔۔۔۔۔۔۔اسے کیا خبر کہ اس طرح بھرے میز کے سامنے اگر میں بیٹھی بھی ہوں تو چائے کے ہر گھونٹ کے ساتھ میرے دانتوں میں اب بھی سوکھی ہوئی روٹی کی آواز ابھرتی ہے۔ جیسے میں صبح کی اذان کے ساتھ ہی خان کے گھر جاتے ہوئے چائے مانگتی تو ماں باپ کی بڑ بڑاہٹ میں ملنے کے بعد گڑ کی ایک ڈلی کے ساتھ ٹوٹے ہوئے پیالے میں چائے ڈال کر ملتی اور میں سوکھی روٹی اٹھا لیتی۔ ہم گھر میں نو افراد تھے چار بہنیں، تین بھائی ماں باپ۔ اف میرا وہ بے درد ظالم اور کاہل باپ وہ غریب اور بیمار ماں جو ہر صبح صرف باتوں، گالیوں سے ایسا پیٹ بھر دیتی کہ پیٹ کی بھوک اڑ جاتی۔ باقی بہن بھائی مجھ سے چھوٹے اور نا سمجھ تھے۔ میں چودہ سال کی تھی اتنا پتہ تھا کہ ہم خان کے چڑوسی ہیں۔ اور ایک کمرے کے عوض میں صبح تا شام ان کے گھر لٹو کی طرح گھومتی رہتی۔ بی بی کہا کرتی تھی کہ چھوٹی لڑکی کام کے لیے اچھی ہوتی ہے وہ تھکتی نہیں۔ میں نے آنکھیں موند لیں جیسے میرے

جسم میں زور سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی ہوں۔"

"کاغذی اوراق" سلمیٰ شاہین"

محترمہ شاہین کی ساری کہانیاں غربت اور امارت کے بیچ پستے ہوئے انسانوں کی درد کی کہانیاں ہیں یہاں میں افسانہ "مگوٹہ" سے اقتباس ضرور پیش کرنا چاہوں گی۔

گھر کے تمام افراد نوحہ خواں تھے میں اس کی ماں اور چند بچوں کو گھر لے آئی تھی سرسوں کے تیل سے اس کے زخموں کو ٹکور دیتی رہی۔ اس کی ناک اور اس کا منہ زخمی ہو گئے تھے۔ اس نے تیزی سے اپنی جان چھڑائی پھر بھاگی۔ میرے والدین بیٹھے ہوئے تھے بچہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ دس سالہ بچہ اتنی مار پڑی کیونکہ وہ کام پر نہیں گیا تھا۔ اس کا کام کیا تھا؟ اس کی ماں بتا رہی تھی کہ اس کو پچھلے دنوں لوہار کے ساتھ بٹھایا تھا کہ کچھ ہنر سیکھ سکے۔ وہ اس سے اپنے بچوں کی رکھوالی کرواتا رہا۔ پھر اس کو بڑھئی کے پاس بٹھا دیا اب یہ وہاں بھی کچھ دنوں سے نہیں جا رہا۔ ماں نے کہا کپڑے بدل کر کام پر جا۔ میں نے اس سے پوچھا بھی مگر یہ ہے کہ کچھ بتاتا بھی نہیں اللہ جانے ویسا کیا کہا بڑھئی نے کہ یہ مشین سے اور اس سے دونوں سے ڈرتا ہے۔

"مگوٹہ" کاغذی اوراق" سلمیٰ شاہین

ایک دوسرے افسانے "سونے کا پنجرہ" سے اقتباس ہے۔

"دیکھو کئی تعلیم یافتہ خواتین جو زمانے کی جبر و ستم کا شکار ہیں۔ کوئی بھی ان کا حق نہیں دیتا۔ کچھ بہنیں ہیں، کچھ مائیں ہیں، کچھ بیویاں ہیں بس ایک چکر و یو میں پھنسی ہیں۔ ساری انصاف مانگتی ہیں کتنا مشکل کام ہے۔ کچھ تو بہتان تراشی پر اتر آتی ہیں اور کچھ حق کے حصول میں ماری جاتی ہیں۔ میں جیسے تقریر کرنے پر اتر آئی تھی۔ میں نے اس پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ پھر میں سر جھکا کر دوبارہ اپنے کام میں لگ گئی۔ میں نے اسے بغیر دیکھے کہا "تم کیا کر رہی ہو؟ تم تو اپنی پسند سے سونے کے پنجرے میں بیٹھی ہوئی ہو۔ بہت کچھ ہے تمہارے پاس۔ تمہارے تو ایسے مسائل بھی کچھ نہیں"

اس نے مجھے دیکھا اور بولی "انسان کی تکمیل سونے چاندی سے نہیں ہوتی یہ بات کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ انسان تو جذبات اور احساسات بھی رکھتا ہے۔ لکڑی۔ لوہا۔ اور زر تو مادی دنیا کی

چیزیں ہیں۔ اور میں تو عورت ہوں۔ سونے کا پنجرہ ایک اچھے اور سچے ساتھی کا نعم البدل کبھی نہیں بن سکتا۔ اس پنجرے میں کچھ پرندوں کا شور بھی ضروری ہوتا ہے۔ تنہائی تو انسان کو آہستہ آہستہ مارتی ہے۔ اب میرا کیا ہے؟ میں تو مر گئی ہوں۔ میں نے سوچا اس کی میت پنجرے سے کیسے نکلے گی۔ اس کا احساس اس کے ادھورے ارمانوں اور بے وقت موت نے اسے اسی پنجرے میں دفن کر دیا تھا۔ اس نے آنسو بھری آنکھوں سے جیسے کہا "معاشرہ مجھے نہیں مار رہا میرے اپنے مجھے مار رہے ہیں۔ یہ پنجرے بہنوں کے لیے نہیں کھلتے کیونکہ بہنیں جذبات اور احساسات نہیں رکھتیں بلکہ حصہ رکھتی ہیں۔ اور بیٹیاں پنجرے کا دروازہ کھولنے کا ہنر جانتی ہیں۔

"کاغذی ہواؤں میں۔ ص" 43

محترمہ سلمیٰ نے ایک تحریر آبادی پر لکھی ہے اس سے اقتباس یہاں شامل کر رہی ہوں۔
"کسی کے پاس روٹی نہیں اور کچھ اس ملک میں ذاتی جہازوں کے مالک ہیں یہ ملک غریب نہیں ہے۔ آبادی کا بوجھ نہیں رکھتا دولت کی غیر مساویانہ تقسیم ہے۔ محنت کا بدل کیا ہے؟ مزدور کی اجرت کیا ہے؟ سرمایہ کار کے آرام کا بدل ہے کھربوں اربوں روپے۔ میں نے کہا وہ کہتے ہیں "مجھے مت مارو میں بوجھ نہیں ہوں' میں تو مزدور کی خوشحالی کا سرمایہ ہوں۔ میں تو ایک مڈل کلاس والد کی آرزوؤں کی تسکین ہوں۔ آبادی بہت ہے، مگر یہاں کھانے والے بہت ہیں جو چوہے کی طرح بل میں گھس جاتے ہیں اور پھر دکھائی نہیں دیتے۔ جسم کھاتے ہیں اور پتہ نہیں چلتا درخت کو اندر سے کھا کر گرا دیتے ہیں۔

کاغذی ہواؤں میں۔ ص۔" 57

محترمہ شاہین کے افسانوں میں منظر کشی کے ساتھ چھپا ہوا پیغام ہوتا ہے اور یہ تقریباً اس کے تمام افسانوں میں نظر آتا ہے ایک افسانہ "زنجیر" سے اقتباس پیش کرتی ہوں۔ اس افسانے نے ذاتی طور پر بہت متاثر کیا ہے۔

"اب چاند ہمارے کمرے کے اوپر تھا میں آہستہ سے کمرے سے باہر نکلی۔
غیر ارادی طور پر شہباز کے کمرے کی طرف جا نکلی عجیب سی مسرت
محسوس کر رہی تھی جیسے میں اسے صدیوں سے جانتی ہوں۔ جیسے عرصے
بعد کوئی قیدی قید سے رہا ہوا ہو اور وہ خوشی کے اظہار سے بے خبر ہو۔ اس کا

کمرہ دور نہیں تھا۔ مگر آڑے ترچھے راستے پر پتھروں اور نشیب و فراز نے مجھے تھکا دیا تھا۔ پھر سلیپر اتنے نرم تھے کہ پتھر ان میں گھس گھس کر میرے پیر زخمی کر رہے تھے۔ سانپ بچھو کا بھی خطرہ تھا مگر میں ذری نہیں میرے راستے میں کچھ بھی رکاوٹ نہیں بنا میں بس چلتی جا رہی تھی اور جب وہاں پہنچی تو میری سانسیں بے ترتیب ہو چکی تھیں۔ خود پر نظر پڑی تو بکھرے بال، تھکا تھکا وجود۔ سو جھی ہوئی سرخ آنکھیں۔ اپنی حالت دیکھ کر میں اداس سی ہو گئی۔ جب میں کمرے تک پہنچی تو شہباز کے کمرے کی بتی جل رہی تھی میں بلا جھجک نیم وا دروازے سے اندر گھس گئی۔ شہباز صوفے پر بیٹھا ہوا سگریٹ پی رہا تھا مجھے دیکھا پھر آہستہ سے بولا اندر آؤ۔ اور میں بے اختیار اس کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ وہ کچھ بولا نہیں بس مجھے اپنی بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ میں زور زور سے رو رہی تھی۔ میرے بہتے ہوئے آنسو اس کے گریباں کو بھگو رہے تھے۔ اس نے آنکھیں بند کیں۔ اور اس کے آنسو زمین پر گرنے لگے۔ میں نے پوچھا رات کے دو بجے ہیں دروازہ کھلا ہوا تھا کیوں؟ وہ کہنے لگا" یہ تو پچھلے دس سالوں سے یونہی کھلا ہوا تھا۔ اچھا ہوا تم آگئی" میں نے سکون کا سانس لیا جیسے یہ سب اسی طرح ہونا چاہیے تھا۔ ہم اسی طرح بیٹھے رہے۔ میرا سر اس کے سینے سے لگا ہوا تھا شاید کچھ دیر کو میری آنکھ بھی لگی تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں میں اس وقت کائنات کے ہر غم سے دور اس کے قریب اس کے پناہ میں تھی۔ اس نے میرے گالوں کا بوسہ لیا اور کہا" اٹھو میں تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ آتا ہوں۔ پاگل تم تو اکیلی آئی تھی۔ یہ تو رات ہے اندھیرا ہے جنگل ہے ہر بلا کا سامنا ہو سکتا تھا۔ میں نے کہا ہاں اب چلو اب ڈر لگتا ہے۔ وہ ہنسا" تم نہیں ڈرتی۔ محبت ڈر ہی نہیں سکتی۔ محبت تو محبت ہوتی ہے۔ کوئی کمزوری نہیں مانتی میں تم سے پاکیزہ محبت کرتا ہوں" دو روحوں کے ملاپ کی محبت۔

"ترنجیر۔ کاغذی اور ترقی۔" ص۔" 68

"پیشانی چمکنی، بلیغ کیچوے" محترمہ شاہین کا ایک علامتی افسانہ ہے جس سے ایک اقتباس ہے۔

"ایسے لوگ قابلِ رحم ہوتے ہیں جو محنت اور تخلیق کے معنی کو سمجھتے ہیں اور
سچ میں اپنے فن کو دل کے خون سے سینچتے ہیں۔ وہ ایسی خوشامد کیسے کر سکتے
ہیں۔ اور یہ سارے کام کہاں کرتے ہیں۔ پروگرام جاری تھا میں نے ساتھی
کو دیکھا اور اس سے کہا" چلو چلتے ہیں" میرا دل ڈوبنے لگا میں نے اس
gathering پر نظر ڈالی میں نے سوچا میں تو اس لیے آئی تھی کہ کچھ سیکھ
سکوں۔ مگر یہ کیا ہے؟ یہ میں کس کی ٹولی میں بیٹھی ہوں۔ میں باہر نکلی
سامنے پی سی میں تصویروں کی نمائش لگی تھی نمائش کا افتتاح ہونے والا تھا
میرے پاس کارڈ تھا۔ ہم سیڑھیوں پر چڑھنے لگے۔ میں سوچ رہی تھی یہ
کتنی بلندی پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ واقعی ہنر میں عظمت ہے۔ میں نے آہستہ
سے دروازہ کھولا۔ سارے ڈیسنٹ لوگ تھے۔ ڈیسنٹ باتیں تھیں۔ تقریر
جاری تھی۔ اصلاح کے بدلے گالیاں کہیں کوئی سمجھا رہا تھا۔ ہر چیز کو ہمیشہ
کے لیے برا نہیں کہہ رہا تھا۔ اپنا علم آرٹسٹ کے اوپر نہیں تھوپ رہا تھا۔ وہ
اپنے علم کو بانٹ رہا تھا۔ اچھا برا کچھ بھی نہیں تھا بس کام تھا اور کام کو اور اچھا
کرنے کے لیے فرضی زندگی کی جدوجہد تھی۔"

"کاغذی اوراق:"

ایک اور افسانے "بھیڑیا" سے اقتباس ہے۔
"مجھے یہ یقین تھا کہ اگر میں دروازے پر دستک دوں گا۔ تو کوئی ضرور جواب
دے گی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر کوئی آدمی رات کو دروازے پر دستک
دے تو وہ کچھ بھی نہ بولے۔ مجھے نہیں علم میں نے کیسے سیکنڈوں میں فیصلہ
کیا اور کسی کو بتائے بغیر پستول اٹھایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا روانہ ہوا۔
ٹارچ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں لوگوں کی بھیڑ سے نکل کر آگے بڑھا۔ وہ
دیکھو کون گیا۔ یہ کون تھا۔ کوئی بولا۔ اور میں نہ جانے کس جذبے کے تحت

اس کے دروازے پر پہنچا۔ میں حیران تھا گھپ اندھیری رات اور جھینگر ںے کی غراہٹ۔ مجھے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ اس کے کمرے سے کچھ فاصلے پر تھا۔ یہاں سے دور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ اس کے کمرے کے پاس بر آمدے میں ہو۔ میں نے اس کے دروازے پر دستک دی اور احتیاطاً اسے آواز بھی دی۔ ٹارچ کی روشنی پھیل رہی تھی۔ مجھے سمجھ میں یہ نہیں آرہا تھا کہ جانور روشنی سے بھاگتا ہے یا بھوکے جانور کی طرح ٹارچ کے ساتھ انسان کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ میں اس کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا جس کی وجہ سے میرے ڈر کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ یہاں مجھے یہ احساس ہوا کہ شاید وہ مجھے میری زندگی سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ اس نے جب میری آواز سنی تو فوراً دروازہ کھولا کیوں شہباز؟ اس کی عجیب حالت تھی۔ ننگے سر ننگے پیر سردی سے کانپتی ہوئی۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کیا اس نے بجلی کے بٹن پر اپنی انگلی رکھ دی کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ یہاں تو بجلی ہے، میں نے ٹارچ بند کر دیا۔ وہ پھر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ جراب پہنے، چادر اوڑھ لی اور آہستہ سے بولی۔ کیوں خیریت تو ہے؟ میں نے پوچھا تم سو رہی تھی؟ وہ بولی ہاں۔ میں نے پوچھا "تم یہ آوازیں نہیں سن رہی تھی؟ کس کی۔ کوئی بیار تھا؟ نہیں میں تو اس لیے آیا کہ شاید تم ڈر رہی ہو۔ وہ بے خیالی سے بولی" نہیں اب میں ڈرتی نہیں زندگی تو ہر وقت ہیبت زدہ ہوتی ہے۔ کبھی لوگوں کے رویے اور کبھی لوگ۔ رنگ رنگ کے تماشے ہوتے ہیں۔ اب تو میں بھی پتھر ہو گئی ہوں۔"

"کانٹوں اور ازنی۔ ص:"

افسانہ ہی "کتے" سے یہاں ایک اقتباس پیش کرنا ضروری سمجھتی ہوں کیونکہ یہ محترمہ شاہین کی ایک اعلیٰ تخلیق ہے۔

"اف تم وہ منظر بھولے تو نہیں ہو۔ بھول بھی کیسے سکتے ہو وہ تو بھولنے کی بات ہی نہیں ہے۔ تم حیران تھے کہ تمہارے کتے کو کیا ہوا۔ تم تھک گئے تھے میں بھی تھکی ہوئی تھی۔ ہماری سانسیں

بے ترتیب تھیں۔ لڑائی بھی تو بہت ہوئی تھی یہ تو تمھارا حوصلہ تھا مگر کتے بھی تو بہت تھے۔ میری تو اور ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی۔ میں کیا کر سکتی تھی تمھارے کتوں کے ساتھ میں تو ان سے واقف ہی نہیں تھی۔ مجھے تو بس اپنے کتوں سے شناسائی تھی۔ جو صرف بھونکنا جانتے تھے کاٹنا نہیں۔ تم مجھے بچانا چاہتے تھے۔ تمھارے ہاتھ پیر زخمی ہو گئے تھے۔ انسان تھے آخر گر پڑے اور جب تم اٹھ رہے تھے تب ایک بڑے کتے نے مجھ پر حملہ کر دیا۔ میں کراہ تو گئی مگر چیخی نہیں مبادا تم ہمت نہ ہار دو۔ میں نہیں بتا سکتی کہ وہ درد کیسا تھا۔ اف مجھ پر تو بیتی اللہ ہر ایک کو اس درد سے بچائے اتنا کہ کوئی اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔ میری جب درد سے آنکھیں بند ہونے لگیں تو تمھارا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ تم ہیبت زدہ ہو گئے ڈرے ہوئے خاموش سے۔ تم کچھ بولے۔ میں اگر کچھ بولتی تو تم کیسے سن سکتے تھے۔ تم سن ہی نہیں سکتے تھے۔ میں نے پہاڑ کے نیچے سے تمھاری طرف حوصلے کا ہاتھ بڑھا دیا" کہ میں ٹھیک ہوں۔

سلمیٰ شاہین کے افسانوں میں روایتی اور سماجی خط و خال ملتے ہیں۔ وہ غلط نظام جس نے پشتونوں کو جکڑا ہوا ہے اس سے نجات کا راستہ اور پیغام بھی ملتا ہے۔ وہ پشتون معاشرے کے مثبت اقدار کو سراہتی ہیں اور غلط رسم و رواج کے خلاف ہیں۔

* * * *

باب ششم

سلمیٰ شاہین کا پی ایچ ڈی مقالہ

سلمیٰ شاہین کے تحقیقی مقالات میں سرفہرست ان کا پی ایچ ڈی کے لیے لکھا گیا مقالہ ہے جو پشتو کی جدید نظم گوئی پر ہے۔ مقالے میں ۸۰ نظم گو شعرا کے فکر و فن سے بحث کی گئی ہے۔ فنی اور فکری حوالوں سے پشتو میں نظم کی جدتوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ مقالے میں نظموں کے منتخب نمونے بھی دیئے گئے ہیں اور ان پر تنقید بھی کی گئی ہے۔ ان میں ان کے کئی ہم عصر شعرا بھی شامل ہیں۔ اپنے ہم عصروں کی شاعری کا غیر جانبدارانہ تنقیدی احاطہ کرنا مشکل امر تسلیم کیا جاتا ہے لیکن سلمیٰ نے جدید نظم پر اپنے تنقیدی شعور کی روشنی میں تبصرے کیے ہیں۔ اس جدید دور میں پشتو کے نامور شعرا غنی خان، کاکاجی صنوبر حسین، اجمل خٹک، سلیم راز، قلندر مومند، ڈاکٹر محمد اعظم اعظم اور رحمت شاہ سائل جیسے شعرا شامل ہیں۔ اس مقالے میں ۱۹۰۱ سے ۲۰۰۰ تک کے نظم گو شعرا کے فن کا احاطہ کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ پشتو اکیڈمی پشاور نے ۲۰۰۳ میں کتابی صورت میں شائع کیا ہے جو ۵۷۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ مقالے کا انگریزی ترجمہ ڈاکٹر اقبال نسیم نے کیا اور شائع کیا ہے۔ مقالے کے نو ابواب ہیں جن میں جدید پشتو نظم کا تعارف، بیسویں صدی کے ابتدا سے لے کر ۱۹۵۰ تک اور پھر ۲۰۰۲ تک کی نظم، اسلامیہ کالج پشاور اور ایڈورڈز کالج پشاور سے وابستہ شعرا کی نظم گوئی، اور دوسری زبانوں سے نظموں کے تراجم سے بھی بحث کی گئی ہے۔ پشتو میں جدید نظم کے مستقبل پر بھی ایک باب شامل ہے۔ ایک باب میں افغانستان کے جدید نظم گو شعرا کا تعارف اور اور نمونہ کلام دیا گیا ہے۔ وہ اپنے اس تحقیقی مقالے کے ضمن میں لکھتی ہیں:

> "میں نے اپنے اس مقالے میں یہ کوشش کی ہے کہ جدید نظم کے اس تاریخی تنقیدی جائزے میں سلسلہ وار ۱۹۰۱ سے ۲۰۰۰ کے آس پاس ان تمام شعراء ان کے عہد اور نظموں کو موضوع بحث ٹھہراؤں جن کا تعلق کسی نہ کسی صورت نظم سے ہے"

سلمیٰ شاہین نے اس مقالے میں کلاسیکی اور جدید دونوں رجحانات سے بحث کی ہے۔ انہوں نے جدید پشتو نظم کا تعلق انگریزی ادب اور اس کے اثرات سے جوڑا ہے۔ پشتون شعرا نے انگریزی شاعری کے زیر اثر پشتو نظم کو جدت آشنا کیا ہے۔ جدید شاعری ایک نئے دور کی ذہنیت کی عکاسی کرتی ہے۔ اور یہی ہوبی اصطلاح میں جدیدیت ہے۔ سلمیٰ شاہین نے سو سالوں کی پشتو نظم کی فکری و فنی ارتقا کا تنقیدی جائزہ لیا اور روایت سے جدت کے سفر کو نمایاں کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

"جدید نظم پشتو میں ایک اہم موضوع ہے۔ ہر چند کہ قدوؤں نے جدید ادب کے موضوع پر مقالے اور مضامین لکھے ہیں مگر پھر بھی ایک تشنگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ صرف نظم کے حوالے سے کوئی کوئی ایسی تحقیق موجود نہیں تھی جس میں جدید نظم کی ہیئت اور مضامین کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہو"

انہوں نے جدید نظم کے پس منظر کے طور پر پشتو کے پہلے شاعر امیر کروڑ اور اس کے بعد کے ادوار میں پشتو نظم کی روایت کا بھی تمہیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ انہوں نے اپنے اس تحقیقی کاوش کے بارے میں بتایا کہ پشتو میں جدیدیت پر فکری مباحث بھی کم تھے اور جدید نظم کا تنقیدی مواد بھی برائے نام تھا۔ میں شعرا کے شعری مجموعوں کے ساتھ ساتھ ادبی تذکروں اور رسائل و جرائد کو بھی کھنگالا ہے۔ کئی جدید نظم گو شعرا کے شعری مجموعے شائع نہیں ہوئے۔ کئی شعرا جن کے سات آٹھ مجموعے شائع ہوئے ہیں ان کا مطالعہ بھی ضروری تھا۔ اس تحقیق میں سارے ذرائع استعمال میں لائے گئے ہیں۔

محترمہ سلمیٰ شاہین نے پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان "جدید نظم پہ پشتو کی" سال 2003 میں مکمل کیا۔ یہ مقالہ پہلی بار 2003 میں شائع ہوا اور دوسری بار 2012 میں شائع ہوا۔ اس کتاب کے جملہ حقوق پشتو اکیڈمی کے پاس ہیں۔ اس کتاب کے شائع ہونے میں مالی مدد اکادمی ادبیات پاکستان اسلام آباد نے کی ہے۔ محترمہ سلمیٰ شاہین نے اس کتاب کا انتساب عالم انسانیت کے عالمگیر احساس کے نام کیا ہے جو بیسویں صدی میں پشتو میں جدید نظم کی تخلیق کا سبب بنا۔ محترمہ سلمیٰ شاہین نے اس تحقیق کو نو اہم ابواب میں تقسیم کیا ہے پہلے باب میں اس نے جدید نظم کی تعریف اور اس کی ابتدا۔ اور پشتو میں اس کی داخلیت کے بارے میں تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ یہ بہت اہم موضوع ہے۔ اگرچہ پشتون ادیبوں شعرا۔ محققین۔ علما نے وقتاً فوقتاً جدید یا نئے ادب کے حوالے سے مقالے

اور مضامین لکھے ہیں مگر پھر بھی یہ کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی کہ نظم میں تحقیقی، تنقیدی، اور تاریخی انداز میں ایسی کوئی منظم کتاب موجود نہیں تھی جس میں نئے دور کے نظم کی ہیئت اور مضمون کا تنقیدی جائزہ پوری طرح لیا گیا ہو۔ پشتو کی تعلیمی نصاب میں بھی جدید شعراء کی نظمیں اور جدید شاعری کی کتابیں شامل ہیں۔ مگر جدیدیت کی ادبی اصطلاح کے حوالے سے ایسی کوئی وضاحت یا تشریح نہیں تھی۔ مثلاً ادب میں جدیدیت کیا ہے۔ اور پشتو نظم میں اس کا آغاز کب اور کہاں سے ہوا اور اپنی تاریخی اور ارتقائی عمل میں اب تک کے زمانے کی رفتار میں کن مراحل اور تجربات سے گزرا ہے۔ اور اب تک کن پڑوسی ملکوں یا غیر ملکی زبانوں کے اثرات قبول کیے ہیں۔ میں نے اس مقالہ "جدید نظم پشتو کی" میں یہ کوشش کی ہے کہ جدید نظم کی اس تحقیق میں تاریخی، تنقیدی، تحقیقی 1901 سے 2000 کے آس پاس وہ تمام جدید شعراء ان کے ادوار، ان کی نظمیں موضوع بحث لاؤں جو کسی نہ کسی شکل میں جدید نظم کے ساتھ ہیں۔

محترمہ شاہین پہلے باب میں لکھتی ہیں۔

"پشتو ادب کی تاریخ کے الگ الگ پڑاؤ ہیں۔ ادب کی معلوم تاریخ کے مطابق پشتو نظم نے ہر دور میں مضمون اور معنی کے لحاظ سے انداز بدلے ہیں۔ مگر ہیئت یا فارم کے لحاظ سے بیسویں صدی سے پہلے کوئی خاص تجربے نہیں ہوئے۔ کلاسیکی دور میں غزل مرکزی صنف رہا ہے اور رباعی قصیدہ۔ قطعہ۔ ترکیب بند۔ مخمس۔ مسدس اور مثنوی نظم کے منتخب اصناف رہے ہیں۔

ادب کی تحریر شدہ تاریخ کے مطابق کلاسیکل دور میں کی گئی تحقیق کی روشنی میں ہم ہر مکتبہ فکر، شعر کے مضمون، اسلوب، انداز اور نمائندہ افکار سے باخبر ہیں اور زمانے کی تسلسل کے لحاظ سے ادب کی کڑی میں اسے گن سکتے ہیں۔ اس سے ہم پشتو زبان کے مضبوط احساس کا اندازہ بھی لگا سکتے ہیں۔ اور جسے ہر مکتبہ فکر نے ایک مربوط تحریک کی صورت میں جاری رکھا ہے۔ جہاں تک پشتو میں نظم اور جدید نظم کا تعلق ہے تو یہ بات عیاں ہے کہ ایک ادبی رجحان نئے تحریک کی بدولت جدید نظم پشتو میں دوسری زبانوں کے بعد آیا ہے جس کا آغاز بیسویں صدی کے آس پاس ہوتا ہے۔ مگر جب ہم کل شاعری کے دور پر نظر ڈالتے ہیں تو پھر یہ کہہ سکتے ہیں کہ نظم کی جدید اور قدیم

دونوں ہیئتوں میں پشتو قدیم آثار رکھتی ہے۔ جس کا معلوم شاعر امیر کروڑ کا جہان پہلوان اور بیٹ نیکہ کی مناجات نظمیں ہیں۔ جو خاص ملی اوزان رکھتی ہیں۔

محترمہ سلمیٰ شاہین نے جدید اور کلاسک کا موازنہ کچھ یوں کیا ہے۔

"جدید یا جدیدیت اصطلاح کلاسیکیت کے مقابلے میں پہلے آتی ہے۔ یہ دراصل یورپی اصطلاح ہے جو ادبی رہنمائی کے لیے یونان یا روم کے ادیبوں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ہیئت پرستی، قدامت پسندی، عقلیت، اصول پسندی اور اعتدال کلاسیکیت کی خاص شکلیں ہیں۔"

ڈاکٹر تبسم کاشمیری جدیدیت کے بارے میں کہتے ہیں۔ "ہر عہد اپنے ادبی تجربے کی بنیاد پر اپنے عہد کی تہذیبی ثقافتی اور معاشی ادراک سے حاصل ہونے والے فلسفہ اور حدود کا تعین کرتا ہے جن کا ادراک کوئی خاص عہد کرتا ہے۔ کسی خاص عہد کا یہ فلسفہ اور اس سے پیدا ہونے والے ادب اپنے عہد سے پہلے کے ادب و فلسفہ کا تاریخی شعور رکھتے ہوئے اس کی نفی کرتا ہے اور اس نفی کے نتیجے میں مثبت رویے تلاش کر کے ادبی تشکیل کا کام انجام دیتا ہے مگر کسی خاص عہد کا فلسفہ جتنا بھی وسیع امکانات اور حدود کا حامل ہو ان حدود کی ایک حد ضرور ہوتی ہے۔ یہ عہد اپنے تخلیقی تجربے کا سفر ختم کر کے حدود کا تعین کرتا ہے۔

"جدید نظم پہ پشتو کی" ص 18

محترمہ شاہین لکھتی ہیں کہ افراسیاب خٹک نے کہیں کسی مضمون میں لکھا ہے کہ "دینی مدرسوں اور آزاد سکولوں میں پرورش پانے والا چھوٹا سا دانشور طبقہ آزادی کی تحریک کے لیے مذہبی اور قومی تصورات و نعرے تلاشنے میں مصروف رہا۔ شعر و ادب نے حریت پسندانہ اور اصلاح پسندانہ تصورات پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا فضل محمود مخفی۔ عبدالاکبر اکبر۔ عبدالمالک فدا۔ ماسٹر عبدالکریم۔ غنی خان۔ اور دیگر دانشوروں کا کردار اس سلسلے میں قابل ذکر ہے۔ باجوڑ کے رہنے والے مولانا فضل محمود مخفی نے سب سے پہلے ایک آزاد جدید قومی ریاست کی قیام کے خدوخال کو واضح طور پر پیش کیا۔ ان کی نظمیں آزاد سکولوں نوجوانوں میں بہت مقبول

ہو گئیں۔"

"جدید نظم پہ پښتو کی" ص52

باب نمبر 2 میں محترمہ سلمیٰ شاہین نے بیسویں صدی کی ابتداء سے 1950 تک کے شعراء کی جدید نظموں کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ لیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں۔۔۔ "پشتو جدید نظم کی ابتداء بیسویں صدی سے باقاعدہ طور پر شروع ہوئی۔ اس کے پس منظر میں ان علماء اور شعراء کی محنت تھی جو نئے علوم خصوصاً ادب و شاعری کے نئے رجحانات سے باخبر تھے اور برصغیر کا وہ تعلیم یافتہ طبقہ تھا جنہوں نے اردو، انگریزی ادب کا مطالعہ کر کے اثرات قبول کیے تھے۔ دوسرا بڑا اثر ازادی کی تحریک تھی جس کی وجہ سے پښتونوں کے علاقہ میں غلامی کی زنجیریں توڑنے اور اپنی دھرتی پر اپنے اختیار کے لیے جہاد شروع کیا تھا۔ اس جہاد میں بڑے بڑے علماء ادیبوں، شاعروں نے بھی حصہ لیا تھا۔ بلکہ اکثریت نے عوام کی رہنمائی کی حیثیت میں کام کیا تھا۔ ازادی کی یہ تحریک نظم کی اغاز کا محرک ٹھری۔ اور شعر کے زریعے عوام میں ازادی کا شعور پیدا کیا۔۔۔۔۔۔۔ انجمن اصلاح الافاغنہ جس نے بعد میں خدائی خدمتگار تحریک کا نام اپنایا، نے اس دور میں بڑے بڑے شعراء اکٹھے کیے اور شعر و ادب کے زریعے ازادی کی تحریک کو دوام بخشا۔ اس طرح جدید نظم نے پشتو کے دامن میں اپنے لیے جگہ بنائی۔ بیسویں صدی میں نئے دور کے شعراء میں فضل محمود مخفی۔ سید راحت زاخیلی۔ محمد اسلم خان کمالی۔ فضل اکبر بیتاب۔ محمد اکبر خادم۔ عبد الحنان خان۔ میاں ازاد گل۔ عبد المالک فدا۔ عبدالاکبر خان اکبر۔ سمندر خان سمندر۔ صاحبزادہ ادریس۔ فضل رحیم ساقی۔ شیر محمد مینوش۔ میر رحمان غازی۔ امیر حمزہ خان شینواری۔ شامل ہیں۔

محترمہ شاہین جدید نظم کے حوالے سے امیر حمزہ خان شینواری کے بارے میں لکھتی ہیں۔۔۔۔۔

> "پشتو جدید نظم کا کارواں 1950 تک جب پہنچتا ہے تو زندگی کے مختلف حادثات کا سامنا کرتا ہے۔ وہ تحریک جو غلامی کے دور میں بیسویں صدی کے اغاز میں شروع ہوئی تھی، جس کی بنیاد ازادی کے مضبوط احساس پر تھی تھی۔ اس احساس نے پښتونوں کو سیاسی پارٹیوں، اصلاحی تنظیموں میں اکٹھا کیا تھا۔ اور کہیں ازاد فکر شاعروں کو پیدا کیا تھا جن کی زندگی کا مقصد فرنگی

غلامی سے ازادی کی تمنا بلکہ ایک انقلابی سوچ تھی جس نے شعر کا پر دہ اوڑھا
اور جدید نظم کی ابتداء کا باعث بنا۔ پشتو جدید ادب کی تاریخ کے سلسلے میں
شعر کے حوالے سے ایک عظیم نام امیر حمزہ خان شینواری کا ہے۔ حمزہ
شینواری جنہیں پشتون عوام نے امیر المتغزلین کا خطاب دیا ہے۔ لواڑگی
لنڈی کوتل میں شینواریوں کے خوگہ خیل اشرف خیل میں ملک میر باز خان
کے گھر 1908 میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں پرائمری سکول
کے علاوہ پشاور کے مشہور اسلامیہ کالجیٹ سے حاصل کی۔ میٹرک کے بعد
اپنے مضطرب فطرت کی وجہ سے زندگی کے ہنگاموں میں داخل ہوئے۔
شعری صلاحیت کا علم پانچویں جماعت سے ہوا تھا مگر شعر کا اغاز بعد میں
کیا۔ اغاز میں شاعری اردو زبان میں کی لیکن اپنے مرشد سید عبد الستار بادشاہ
جان کی نصیحت پر پشتو میں شعر کہنا شروع کیا۔ حمزہ کی شاعری کا مرکزی
مضمون تصوف، حسن اور محبت رہا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے
پشتون اور پشتونولی کو بھی ساتھ رکھا۔ خوشحال خان خٹک کے بعد حمزہ
شینواری دوسرے بڑے شاعر ہیں جو مقدار اور معیار کی وجہ سے فنی قدرت
رکھتے ہیں۔ قلندر مومند نے حمزہ کو قدیم شاعری کا اختتام اور جدید پشتو
شاعری کا امام کہا ہے۔ قلندر مومند کے مطابق حمزہ کلاسیک اور جدید کے بیچ
پل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ہماری شعری روایت کی کڑی کو نئے عصر سے
ملاتے ہے۔ بخش خلیل نے کہا "حمزہ تخلیقی فطرت اور خداداد لطافت کا مالک
ہے جو ادب، تاریخ، اجتماعیات، فلسفہ، اور اخلاقیات پر عبور رکھتے ہیں جو
تصوف کے عارفانہ رموز کا علم رکھتے اور موسیقیت سے واقف ہیں۔"

محترمہ شاہین نے عالموں، ادیبوں کے تبصروں کے حوالے سے حمزہ بابا کی شخصیت کے ایک ایک
فطری قدرتی فنی رنگ پر روشنی ڈالی ہے اور ان کی شاعری کے نمونے دیے ہیں۔

"جدید نظم پہ پشتو کی" ص "165 - 160

باب سوئم میں 1950 سے بعد تک محترمہ سلمیٰ شاہین نے متوسطین شعراء کے دو گروہ جو

متقدمین اور نئے شعراء کے بیچ میں آتے ہیں، کی نظموں کا تحقیقی، تنقیدی اور تفصیلی جائزہ لیا ہے
محترمہ شاہین لکھتی ہیں۔۔۔۔۔

"پشتو کی جدید نظم کا ارتقائی سفر جو بیسویں صدی سے شروع ہوتا ہے اگرچہ اس کی ابتداء انقلاب سے ہوئی تھی اور ازادی جیسا عظیم مقصد ان کے سامنے تھا اور نظم کی مقصد و غایت ازادی کے حوالے سے عوام کے شعور کو بیدار کرنا تھا اور شاید اسی سبب سے زیادہ وادب، ادبیت اور فنی کمزوریاں بھی رہ گئیں مگر پھر بھی جدید نظم کا یہ باب کئی لحاظ سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس دور میں کئی علمی ادبی اور سیاسی ادبی اور سیاسی شخصیتوں نے شعر و شاعری کی دریافت کی ہے اور جو تاثر اوائل میں تھا اس کو ختم کیا کیونکہ اس سے پہلے شاعری طالبان، مولویوں اخونوں یا پھر گیت گانے والوں کی سمجھی جاتی تھی۔ مگر جب پشتون سنجیدہ شعراء نے اس میں حصہ لیا تو پھر ادب کی قدر و منزلت بڑھی یہ تحریک سیاسی اور عوامی کے ساتھ ساتھ خالص ادبی ہو گئی جس سے تحریک کو فروغ ملا۔ اولسی ادبی جرگہ جو پہلا ادبی جرگہ کہلاتا ہے اور پشتو ادب کے حوالے سے ادب کی آبیاری میں کلیدی کردار رکھتا ہے۔ اس کے محرک و بانی کاکاجی صنوبر حسین تھے۔ ان کے ساتھ دوست محمد کامل۔ حمزہ شینواری۔ سیف الرحمان سلیم۔ صاحبزادہ فیضی۔ اجمل خٹک۔ قلندر مومند۔ بخش خلیل۔ ولی محمد طوفان۔ افضل بنگش اور کئی دوسرے ترقی پسند مکتب کے درخشاں نام ہیں جو قوم پرستی اور ترقی پسندی کو ساتھ لے کر چلے۔

محترمہ شاہین نے اس حوالے سے ایوب صابر کی جدید پشتو کے حوالے سے اقتباس شامل کیا ہے جسے یہاں شریک کرنا چاہتی ہوں۔

"اولسی ادبی جرگہ کے قیام سے قبل پشتو ادب میں تنقید کا رواج نہیں تھا چونکہ اس جرگہ کی قیادت ترقی پسند تھی۔ وہ ترقی پسند شعراء ادباء تنقید نفس پر یقین رکھتے ہیں اس لیے جب پشتو کے بڑے بڑے ستونوں نے اپنے

آپ پر تنقید کی تو پشتو ادب میں یہ رفتہ رفتہ رواج پانے لگا۔
اور اس کو برداشت کیا جانے لگا میں سمجھتا ہوں کہ یہ پشتو ادب کے لیے اولسی جرگہ کا سب سے بڑا عطیہ ہے۔

"جدید نظم پہ پشتوکی"۔ص" 130

محترمہ سلمی شاہین پشتو ادب و سیاست کے نامور شخصیت کاکاجی صنوبر حسین کے بارے میں لکھتی ہیں۔

"کاکاجی صنوبر حسین پشاور کے قریب ولہ نائی گاؤں میں پیدا ہوئے والد کا نام گل فراز تھا۔ دسویں جماعت کے بعد بطور معلم درس و تدریس اپنایا۔ یہ شاہ ولی اللہ کے افکار سے متاثر تھے پھر ہندوستانی سیاست میں سرگرم ہوئے نوجوان بھارت سبھا اور پھر حزب اللہ میں شامل ہوئے۔ انگریز کے خلاف تحریکوں میں عملی حصہ لیا۔ شعر و ادب کے سرپرست اور صحافت کے لحاظ سے ان کا مقام بہت بلند ہے۔ اگرچہ ان کا شعر و شاعری سے زیادہ تعلق نہیں تھا مگر بڑے بڑے شعراء کی تربیت کی۔ 1930 میں دستی چھاپہ خانہ بنایا اور فرنگیوں کے خلاف کتابچے اور اشتہارات کی چھپائی کرنے لگے۔ عوام میں بانٹتے رہے۔ پشتو مجلہ "اسلم" نکالا ساری عمر متحرک رہے اور 1983 میں فوت ہوئے۔ شعراء نے شاعری کر کے انہیں خراج تحسین پیش کیا قلندر مومند کہتے ہیں۔

"حال اور ماضی ہاتھ ملائیں گے
اور مستقبل کاکاجی کا رہ جائے گا
سامراج اس سے راج نہ کر سکا
وہ بے بس عوام کے دلوں کا ترجمان تھا

"جدید نظم پہ پشتوکی"۔

محترمہ سلمی شاہین نے غنی خان کی شاعری اور جدید نظم پر بحث کی ہے وہ لکھتی ہیں۔
"جدید نظم کے متوسطین شاعروں میں غنی خان نہ صرف اپنے عصروں میں

بلکہ بیسویں صدی کے نظم گو شاعروں میں سب سے اہم اور سب سے جدید شاعر ہیں۔ روایات سے بغاوت اصل معنوں میں غنی خان نے کی۔ غنی کی انفرادیت اور جدیدیت یہ ہے کہ اس نے اپنے انداز بیان میں کسی کی تقلید نہیں کی وہ اپنی نظم میں نہ متقدمین کی رنگ رکھتے ہیں اور نہ ہی متوسطین کی۔ غنی خان عقل سے زیادہ وجدان پر یقین رکھتے ہیں اور اپنی شاعری میں وہ خود اپنی ذات اور زندگی کے مسائل و احساسات اور جذبات کے اظہار کے لیے اصول پرستی۔ میانہ روی۔ اور خالص عقلیت اور تقلید سے کنارا کرتے ہیں۔ خیال کی فکری آزادی اور خیالی بغاوت ان کی شاعری کے موضوعات ہیں اور یہی وہ اقدار ہیں جو غنی خان کو بیسویں صدی کے جدید رومانی شعراء میں بہت مختلف اور بہت جدید اور منفرد بناتی ہے۔ ان کے فارمز اور موضوعات ان کے اپنے ہیں ان کے جذبے ان کا اخلاص۔ پیار۔ محبت احساس ان کے اپنے تجربوں اور مشاہدوں سے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ نئے اور جدید افکار کی ترجمانی کرتے ہیں۔ انسان کے پوشیدہ اور آشکارہ جذبوں کا اظہار اتنی بے باکی سے کرتے ہیں کہ وہ خود کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اپنے خیال و معنی و مقصد کی خاطر روایتی اصناف کی پرواہ نہیں کرتے۔ غنی خان کے کلام کا اہم نکتہ ذات کا ہونا اور نہ ہونے کے احساس کے گرد گھومتا ہے۔ ان کی مرکزیت اور تنہائی کا شدید احساس ان کی شاعری میں پڑھنے والے بااسانی محسوس کر سکتے ہیں۔ اسی سوچ اور استغراق میں کبھی کبھی وہ خدا اور بندے یا جان اور جانان کے درمیان تکرار میں بہت نازک مرحلوں سے گزر جاتے ہیں اور زندگی کے گہرے اور گھمبیر فلسفے کے راستے کائنات کے اسرار و رموز کے علاوہ بہت کڑوی باتوں اور تلخ حقیقتوں کی ترجمانی بھی کرتے ہیں۔

"جدید نظم پہ پشتو کی"-ص205-206

محترمہ سلمی شاہین نے اپنی تحقیق میں مشہور پشتون انقلابی شاعر محترم اجمل خٹک کے

بارے میں کچھ یوں لکھا ہے۔

"پشتو کی جدید نظم متوسطین کے دور کا سب سے بڑا اور روشن نام جدید نظم کے حوالے سے اجمل خٹک کا ہے۔ اجمل خٹک نہ صرف جدید نظم کے حوالے سے کلیدی کردار کے مالک ہیں بلکہ انہوں نے مقصدیت، ترقی پسندی، قوم پرستی کے شدید احساس اور جذبے سے ایسی شاہکار نظمیں تخلیق کی ہیں جو عمر کے لحاظ سے بعد میں آتی ہیں مگر اپنے اسلوب اور منفرد انداز سے جدید نظم کا یہ انداز بانی شمار ہوتا ہے۔ اجمل خٹک ایک زبردست شاعرانہ قدرت رکھتے ہیں اس نے نظم کے لیے جو فورم بنیاد رکھی وہ پشتو پڑھنے والے تعلیم یافتہ شاعروں کے لیے پیروی کا سبب بنی۔ ان کی نظمیں تیزی سے پھیلیں اور آہستہ آہستہ اپنا الگ مکتبہ فکر بناتی گئیں۔ ایک مضبوط نظریاتی سوچ رکھنے کے ناطے وہ محدود نہیں رہے ان کی شاعری ہر خاص و عام کو پہنچی سیاسی طور پر چاہے وہ جس بھی پارٹی اور نظریے سے تعلق رکھتے ہوں مگر ایک نظم گو شاعر کی حیثیت سے اپنے پرائے اور مخالفین نے انہیں مانا۔ دراصل اجمل خٹک اپنی قادرالکلامی اور نابغہ اوصاف کی بنیاد پر پشتو کی جدید نظم متوسطین کے دور کے شاعر ہیں۔ جنہوں نے نظم کا معیار مقرر کیا ہے۔ ادبی دنیا میں شاعر انقلاب کے نام سے جانے اور مانے جاتے ہیں۔ قومی آزادی اور قوم پرستی کا ایسا تصور ان سے پہلے کسی نے نہیں اپنایا تھا۔ اجمل خٹک کی نظم کی خصوصیات میں خوبصورت الفاظ کا انتخاب روانی کے ساتھ ساتھ معنی، ابلاغ، بدرجہ اتم موجود ہیں۔ اجمل خٹک بنیادی طور پر واضح عوامی مقصد کے لیے لکھتے ہیں جو معاشرتی خرابیوں، بے انصافیوں، طبقاتی کشمکش اور خاص طور پر پسے ہوئے طبقات کے احساسات کی ترجمان ہیں۔ ان کی نظم میں بہت رنگینی ہے۔ مگر احساس کی تلخی اس رنگینی پر غالب نظر آتی ہے۔ ان کی نظم میں ترقی پسند خیالات بہت واضح ہیں۔

"جدید نظم پہ پشتو کی" ص 249-250

پروفیسر محمد نواز طائر پشتو اکیڈمی کے ڈائریکٹر تھے۔ وہ ادیب، شاعر، محقق دانشور اور جدید نظم گو تھے ان کی خدمات پر تنقیدی نظر ڈالتے ہوئے محترمہ سلمیٰ شاہین لکھتی ہیں۔"

> "پروفیسر محمد نواز طائر جدید نظم کے میدان فن کی ہیئت اور موضوعات کے لحاظ سے اپنے ہم عصر شعراء میں بہت اہم ہیں۔ نظم میں ان کا رنگ معاشرتی اور اصلاحی ہے جدید نظم گو شعراء میں محمد نواز طائر نظم میں اپنا الگ رنگ رکھتے ہیں۔ یہ اپنی نظم میں کوئی بھی انقلابی یا سیاسی پیغام نہیں دیتے البتہ اپنے لوگوں کی بے علمی، محنت، غربت، اور بے ہنری پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ زندگی کو بہت گہرائی سے دیکھتے ہیں اور اپنے تجربوں و مشاہدوں کی روشنی میں زندگی کے سرد و گرم مقابلے کا راستہ دکھاتے اور رہنمائی کرتے ہیں۔

ادب اور نظم میں ان کی فکر بامقصد اور سنجیدہ ہے۔ ان کی جدید و معری آزاد نظموں کی دو تین کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی نظمیں زندگی کے ترجمان ہیں۔ اور محبت، عشق، حسن کے آفاقی رنگوں سے معمور ہیں۔ یہ فکر و نظر کی ایک ایسی دنیا رکھتے ہیں جو زندگی کی تلخ حقائق کی جانب اشارا کرتے ہیں اور ان رنگوں سے واقف ہیں۔ جس کے حصول سے انسان اپنی تمدن، کی ابتداء سے فطرت کے خلاف بر سر پیکار ہے۔ ان کے کلام میں انسانی تمدن، ارتقاء اور خوشحالی کی دعوت ہوتی ہے۔ یہ وہ جذبات اور احساسات ہیں جس کا طائر صاحب نے اپنی انسانی فطرت کے تجربات کا اظہار کیا ہے۔ سچائی کی سبب ان کے کلام کو آفاقیت ملی ہے۔" پرواز " ان کی ایک طویل نظم ہے جو تمثیلی انداز میں لکھی گئی ہے۔ فنی لحاظ سے یہ ایک معری نظم ہے۔ جو 1962 کے سہ ماہی مجلہ " پشتو " میں شائع ہوئی۔ اور بعد میں کتابی صورت میں آئی۔ یہ دراصل زندگی کے ایک تعمیری فلسفے کا ترجمان ہے۔ یہ مسلسل بیانیہ نظم ہے۔ جو واقعاتی انداز میں اپنی منزل اور مقصد کو اپنے منطقی انداز میں پہنچاتی ہے۔

جدید نظم کی تاریخ میں یہ نظم کئی روایات سے مختلف ہے۔ روانی اور وزن میں یہ نظم اتنی بھرپور اور موزوں لگتی ہے کہ پڑھنے والا کہیں پر اٹکتا نہیں۔ زبان کی روانی نے نظم کو اس معیار پر پہنچایا ہے۔ جہاں پشتو ادب میں اپنے منفرد مقام پر نظر آتا ہے۔ اس نظم میں انہوں نے خیالات کی سحر نگاری کے ساتھ ساتھ الفاظ کی مصوری بھی استعمال کی ہے معلومات کا جو ذخیرہ اس نظم میں

موجود ہے اس سے طائر صاحب کی ذہن کی وسعت کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ یہ نظم اٹھائیس مختلف حصوں میں منقسم ہے اور ہر حصے کا اپنا عنوان ہے۔ پوری نظم کا مخاطب امید پر ہے۔ عنوانات کا تسلسل ایک خوبصورت مصرعے سے باہم مربوط ہے مصرعہ کچھ یوں ہے۔

"خو گہ اشنا زژ گی سرہ ظالمستہ ولیر"

"امید تہ۔ د ژوند حرکت۔ د ماشوتیا حزی۔ د کشمکش لړئ۔ طوفان د خود غرضی۔ پیغام۔ عمومی۔ کردار۔ د بیدیاپہ لور۔ د ماشوم تو بھائی۔ د زلمو پہ وطن کی۔ زلمی کارکنان۔ دیتی گنڈا۔ د حزل پہ لور۔ د حوض حیات پہ غاڑہ۔ وصال تخہ۔ بیداری۔"

اس نظم کا تعین مقصد کی رو سے دو بڑے حصوں میں منقسم ہے ایک یہ کہ دنیا میں آنے کا مقصد اور اس مقصد کی تکمیل میں جو انسانی زندگی پر گزرتی ہے اس کی کہانی ہے اور دوسرا مقصد اپنے ماحول کی قباحتوں اور اپنے رویے کا اظہار ہے۔ پھر ایک آئیڈیل معاشرے کی ارزو اور نامور کرداروں کو سامنے لاتا ہے جس کی شاعر نے خوابوں کی دنیا میں سیر کی ہے۔ یہ نظم اہد زاویوں میں اتنی گیرائی اور روانی رکھتا ہے جو پڑھنے والے کو شروع سے آخر تک موضوع کے ساتھ جوڑے رکھتا ہے۔ کبھی خوبصورت نظارے دیکھتا ہے اور کبھی ہیبت زدہ ہوتا ہے۔ اور کبھی خوش ہوتا ہے۔ نظم میں جگہ جگہ نغمے شامل ہیں جو پڑھنے والے کی تھکاوٹ ختم کرتی ہے۔ تسلسل کی خوبی پیدا ہوتی ہے اور قاری کچھ دیر کے لیے نغموں کی موسیقیت اور ترنم میں کھو سا جاتا ہے۔ پروفیسر نواز طائر نظم میں ایک اچھے معاشرے کی تشکیل کی غرض سے اپنے مقصد اور مدعا میں آئیڈیلسٹ بن جاتا ہے۔

"جدید نظم پہ پشتو کی"

محترمہ سلمیٰ شاہین نے خیبر پختونخوا کی ادبی دنیا کے قدآور شخصیت ڈاکٹر محمد اعظم اعظم کی جدید پشتو نظم کے حوالے سے ان کی شاعری پر تنقیدی نگاہ ڈالی ہے۔ ڈاکٹر اعظم کی شاعری کے بارے میں لکھتی ہیں۔

"جدید نظم کی تاریخی ارتقاء کے سلسلے میں جن جدید شعراء و ادباء کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ خصوصاً پڑھے لکھے لوگ یا اسلامیہ کالج پشاور کے حوالے سے جن نامور شعراء کے علاوہ جدید نظم کے میدان میں عبدالرحیم مجذوب اور ہاشم بابر کے سنگ ڈاکٹر محمد اعظم اعظم کو بھی مانا اور جانا جاتا

ہے۔ اعظم صاحب پشتو ادب کی غزل میں پر کشش انداز رکھتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھے ہنر مند ڈرامہ نگار اور محقق کی حیثیت سے اپنی پہچان رکھتے ہیں۔ اور ایک اچھے نظم گو شاعر ہیں۔ ان کی علامتی و اشارتی نظمیں اپنے دور اور ماحول کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کا بیان واضح ہے اور اشارے، کنایے اچھی طرح استعمال کرتے ہیں۔ ان کی نظموں میں شیریں و بلیغ زبان استعمال ہوتی ہے۔ ان کا مخصوص لہجہ پر اثر تشبیہات، خیالات، انقلابی مقصدیت اور سنجیدگی کی علامت اور مزاحمت سے پر ہے۔ یہ علامتی طور پر اپنے دور کے نظام پر تنقید کرتے اور مستقبل کے لیے حوصلہ، ہمت، جدوجہد کی امید بندھاتے ہیں۔ ان کی نظم کا انداز اپنے ہم عصر شعراء سے منفرد ہے۔ اور اس انداز کی اشارتی نظمیں اگرچہ اپنے ماحول کی عکاس ہیں۔ پڑھنے سننے والے ان کی تشبیہات کو سمجھتے ہیں تو وہ ان کے مقصد کو بھی پہنچ سکتے ہیں۔ کیونکہ ان کے مقصد تک رسائی کے لیے نازک تشبیہات، علامات اور کنایوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ کیونکہ عام قاری اس Indirect انداز کو با آسانی نہیں سمجھ سکتا۔ ان کی دوسری غزل اور نظم اسی طرح کی نظمیں ہیں۔

"جدید نظم پہ پشتو کی" ص 322-323

محترم سعد اللہ جان برق ہماری ادبی و صحافتی دنیا کا ایک بہت بڑا نام ہے انہوں نے پاکستان ٹیلی وژن کے لیے بے شمار ڈرامے لکھے جو عوامی مقبولیت میں سب سے آگے رہے۔ غزل و نظم تحقیق کالم نگاری ان کا میدان ہے۔ طنز و مزاح میں بھی اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ محترمہ سلمٰی شاہین نے اپنی تحقیق "جدید نظم پہ پشتو کی" میں سعد اللہ جان برق کی نظموں اور شخصیت کا کچھ اس انداز سے خلاصہ کیا ہے وہ لکھتی ہیں۔ "سعد اللہ جان برق مسلک کے لحاظ سے ترقی پسند اور رجحان کے لحاظ سے رومانی ہیں۔ ان کا انداز ایک انتہا پسند اور جذباتی شاعر کا ہے۔ متوسطین کی جدید نظم کے شعراء میں اپنے جذباتی انداز کی برکت سے بہت مقبول ہیں۔ طنز ان کی شاعری کی خاصیت ہے۔ اچھے ڈرامہ نگار۔ طنز نگار۔ شاعر اور ادیب ہیں۔ اپنی شاعری اور نظم میں علامت اور ابہام بھی رکھتے ہیں۔ جو بولتے ہیں با مقصد بولتے ہیں۔ اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے ہیں۔ گہرے سیاسی شعور کے مالک ہیں۔ ان کی شاعری میں رومان اور حقیقت کے عکس دونوں نظر آتے ہیں۔ ان کی نظم خوب پر تاثیر اور رواں ہے۔ غزل نظم دونوں لکھتے ہیں۔ ان کے قلم کی نوک کی زد میں وہ تمام لوگ آتے ہیں جو معاشرے میں انتشار کے ذمہ دار ہیں۔ جنہوں نے معاشرے میں طبقات اور تضادات پیدا کیے ہیں۔

جو انسانیت کی گمراہی کا سبب ہیں۔ اور ان کی بے بسی کا تماشہ دیکھتے ہیں۔ ہیئت کے لحاظ سے سعد اللہ جان برق چھوٹی بڑی بحروں میں پابند نظم لکھتے ہیں آزاد اور معری نظمیں بھی لکھی ہیں۔ ان کی شاعری کا مجموعہ "برینا" 1969 میں شائع ہوا جو زیادہ تر نظموں پر مشتمل ہے۔

"جدید نظم پہ پشتو کی" ص: 334-337

محترمہ سلمیٰ شاہین نے اپنے ہم عصر شعراء میں تقریباً تمام شعراء کی فنی، فکری اور شعری صلاحیتوں کو اجاگر کر کے تفصیلی بحث کی ہے محترم سلیم راز صاحب کی فکری اور فنی صلاحیتوں کے بارے بھی تبصرہ اس تحقیق میں موجود ہے، اس سے کچھ حصہ شامل کرنا ضروری سمجھتی ہوں۔

محترمہ سلمیٰ شاہین لکھتی ہیں۔ "جدید دور کے جدید نظم میں متوسطین شعراء میں ترقی پسندوں اور اشتراکی نظام کے پسند کرنے والوں میں ایک نمایاں نام جناب سلیم راز کا ہے۔ فکری لحاظ سے یہ غلط سماجی نظام کے باغی شاعر کہلائے جاتے ہیں۔ ان کی نظم نے اپنے دور کی سیاسی، سماجی، نفسیاتی اور انقلابی واقعات، حالات پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ قوم پرست اور سوشلسٹ شاعر ہیں مسلک سے اشتراکی ہیں۔ احتجاج، بغاوت، و انقلاب ان کی نظم کے موضوعات ہیں۔ اپنی جرات مندانہ انداز بیان کی وجہ سے سلیم راز صاحب اپنے ہم عصروں سے منفرد نظر آتے ہیں۔ خصوصاً نظم میں ان کی فکری انقلاب کے نشان واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ جدید نظم میں جدید فکر اور گہرا اجتماعی شعور رکھتے ہیں۔ بشریت، انسانیت، آدمیت، انسانی عزت و احترام کو ہر چیز سے مقدم مانتے ہیں۔ اور دنیا میں حسن کی بقا کے لیے امن کو ضروری سمجھتے ہیں۔ انسان کی بنیادی ضرورتوں کے لیے زندگی کا حق حاصل کرنے کے حامی ہیں۔ اور مظلوم انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے سماجی انقلاب کے حامی ہیں۔ یہ ترقی تبدیلی یا نظام کی تبدیلی انسان کے لیے راہیں روشن کرتی ہے طبقاتی تضاد کے سخت خلاف ہیں ہیئت کے لحاظ سے انہوں نے جدید آزاد اور معری نظمیں لکھی ہیں "د زخمونو پسرلی" کے نام سے شعری مجموعہ سال 1989 میں شائع ہوا۔ سلیم راز پڑھے لکھے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ترقی پسند مصنفین کے ممبر بھی ہیں۔ اپنی نظم میں مقصدیت اور سنجیدگی کا دامن مضبوطی سے پکڑا ہے۔ عالمی ادب کا مطالعہ بخوبی رکھتے ہیں۔ اور عالمی حالات پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ بہت خلوص سے نئی نسل کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے بچ

کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لوگوں کو ان کا انداز بیاں اچھا لگتا ہے خود بھی ایک عالم شاعر، ادیب، کالم نگار اور بہترین رہنما ہونے کی سبب عوام میں مقبول ہیں۔ لوگ ان کا احترام کرتے ہیں۔ وہ پشتون قوم پرست بھی ہیں مگر ترقی پسندوں میں سب سے زیادہ ترقی پسند ہیں۔ مساوات، انصاف اور انسانی حقوق کا احترام ان کی نظم کے موضوعات ہیں۔

"جدید نظم پہ پشتو کی" ص 338 - 339

محترمہ سلمی شاہین نے اپنی پی ایچ ڈی تحقیق میں سو سالہ جدید شاعری کے شعراء کا تجزیہ بہت باریک بینی سے کیا ہے، اس میں ایک دوسرے بڑے شاعر پیر گوہر کی جدید شاعری کا تنقیدی تجزیہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں۔

" محترم پیر گوہر نے پیر عبد المنظور کے گھر 1931 میں آنکھ کھولی وہ مردان کے علاقہ پیر انوڈاگئی کے رہنے والے تھے۔ پیر انو خاندان کو مردان میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کو 1987 میں ضیا الحق نے شاعر امن کا خطاب دیا تھا۔ پیر گوہر بہت خوش الحان ترنم ساز اواز کے مالک تھے۔ اپنے دور کے اچھے نظم گو شاعر تھے۔ ان کے موضوعات بہت سنجیدہ ہیں اور نظم میں عام عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہ محنت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور ہمیشہ امن و خوشحالی کی خوشخبری دیتے ہیں۔ ان کی نظم پابند ہوتی ہے۔ اور بہت روانی اور سلاست رکھتی ہے۔ ان کی زبان عام فہم ہے جسے سن کر ہر بندے کو معنی سمجھ میں آجاتے ہیں۔ انسان ان کی ذہنی پختگی کی تعریف کیے بنا نہیں رہ سکتا کیونکہ ان کا انداز بیاں مقناطیسیت رکھتی ہے۔ پیر صاحب جس مشاعرے میں موجود ہوتے ہیں اپنی نظم ترنم سے سناتے ہیں چاہے وہ مشاعرہ سٹیج کا ہو ٹیلی وژن یا پھر ریڈیو کا۔ اکثر و بیشتر سامعین سے داد پاتے ہیں۔ ان کی شاعری کے آٹھ مجموعے ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں۔ از غن پھرلی۔ یوٹی لاسونہ۔ شالاتی۔ ژوندے انسان۔ خرابات۔ حق شعور، رنگین خوب۔ اور وروستہ زڑہ۔ ان کے حوالے سے "جدید پشتو ادب" میں لکھا گیا ہے کہ "پیر گوہر پشتو کے ادبی حلقوں میں اپنی ترنم سے پہچانے جاتے ہیں اور ان کی ترنم سے لطف اندوز ہونے کے بعد باشعور سامعین یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگاتے کہ پیر گوہر نے پہلے دھن بنائی اور اس کے بعد نغمہ تخلیق کیا ہے۔ مشاعروں میں جب وہ غزل چھیڑتے ہیں تو یوں لگتا ہے کہ جیسے ان کے گلے میں گھنگرو بج رہے ہوں۔ وہ عالمی امن کے سچے دل سے خواہاں ہیں اور اپنی کئی نظموں میں انہوں نے امن کا پرچار کیا

ہے۔ موضوعاتی نظمیں لکھتے ہیں جو اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ آپ ان کے سامنے کوئی بھی موضوع رکھ دیجیے وہ فوراً پہلے دھن بنائیں گے اور پھر نظم تخلیق کریں گے۔

جدید نظم پہ پشتو کی" ص" 342-343

جدید شاعری کے ایک دوسرے بڑے نام "رحمت شاہ سائل" کی جدید نظم پر محترمہ سلمیٰ شاہین نے کچھ یوں تبصرہ کیا ہے۔

"جدید زمانے کی جدید نظم کے میدان میں رحمت شاہ سائل جو اپنی آواز میں سحر انگیز ترنم رکھتے ہیں اور اپنے ذہن میں قومی تصور اور تاریخی شعور کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ پشتو شاعری اور خصوصاً جدید نظم میں ایک ایسی ہنگامی صورت حال کی فضا پیدا کی، کہ لوگوں نے بہت شوق سے انھیں سنا اگرچہ ان کی شاعری پر حقیقت میں قوم پرست اور متوسطین ترقی پسندوں کا گہرا اثر نظر آتا ہے اور یہ شعوری اور لاشعوری طور پر اپنے پیش رو سے متاثر نظر آتے ہیں۔ یہ بات میں یہاں بے بنیاد نہیں کر رہی ہوں۔ کیونکہ قوم پرستی کی ضمن میں اجمل خٹک کی شاعری اور ڈاکٹر امین الحق امین زر تشت، اور رحمت شاہ سائل کی اسرائیل۔ سعد اللہ جان برق کی سیادم۔ اور سائل کی مرغزار۔ اسلام ارمانی کی "اختر" اور سائل صاحب کی "اختر" فکر کے لحاظ سے ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اور موضوعاتی بنیاد پر سائل جو کچھ کہتے ہیں وہ زیادہ نیا نہیں ہے۔ مگر جس چیز نے سائل کو عوامی مقبولیت بخشی وہ اس کے انداز کی انفرادیت اور جدیدیت ہے اور اس کے لہجے کی بے باکی اور جرات ہے۔ جدید نظم میں اپنا مقصد اور پیغام لوگوں تک پہنچانے میں ان کے ترنم کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مگر صرف ترنم ان کے مقبولیت کی وجہ نہیں ہے بلکہ جدید زمانے کے ارتقاء کی رفتار، ابلاغ کے نئے ذرائع جیسے پشتو اخبارات، رسالے، ٹیلی وژن، ریڈیو، اور سیاسی جلسے اور مشاعروں کے سٹیج کا استعمال بھی اس مقبولیت کی وجہ ہے۔ بغاوت، انقلاب، بد نظمی، کی مذمت، اور ایک اچھے معاشرتی نظام کے لیے وقت کے انتظار

اور امید نے ان کی شاعری میں روح پھونکی۔ سائل نے کئی نظمیں ان موضوعات پر لکھی ہیں۔ اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایسی تکرار اس کی نظم میں یکسانیت پیدا کرتی ہے۔ جو کھٹکتے پڑھنے اور سننے والوں کو شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ سائل کا مشاہدہ بہت گہرا اور مطالعہ بہت وسیع ہے پشتو عوامی شاعری خصوصاً ٹپہ پر ان کا احساس بہت گہرا ہے اور اس میں ٹپہ کی خوبصورتی اور احساس و نزاکت بھی نظر آتی ہے۔ نظم میں ان کے تشبیہات اور استعارے قابلِ تعریف ہیں۔ دل آویز الفاظ کا ذخیرہ اور ان کا برجستہ اور برمحل استعمال ایسے انداز میں کرتے ہیں جس سے پڑھنے اور سننے والے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ سائل اپنے دور کا ترجمان ہے۔ جو کچھ بولتا ہے اپنے دور اور وقت کی مناسبت اور تقاضے سے بولتا ہے۔ بہت نازک سیاسی موضوعات چھیڑتا ہے۔ اپنے دور میں خدائی خدمتگار تحریک جو بعد میں NAPاور بعد میں A.N.p کے نام سے جانی گئی سرگرم کارکن رہے۔ عملی سیاست میں حصہ لیا۔ مزاحمتی نظمیں لکھیں۔ حالات جیسے بھی رہے ہوں سائل نے مصلحت پسندی سے کام نہیں لیا۔ اپنی شاعری خصوصاً نظم میں ہر دور کے جابر، جاگیردار، سرمایہ دار، اور حاکم کے خلاف مزدور اور مظلوم اواز کے ساتھ اواز اٹھائی۔ اس بناء پر ہم ادبی اصطلاح میں سائل کی نظم کو مزاحمتی جدید نظم کہہ سکتے ہیں۔ اپنے دور کے فیڈریشنوں، سٹوڈنٹس یونینز، لیبر یونینز، اور دیگر محنت کش اور پسے ہوئے طبقات میں مقبولیت پائی۔ ہر کسی نے انہیں اپنا ترجمان مانا۔ کیونکہ سائل نے انسانی حقوق کی بات کی۔ اور ان کی اواز بے بسوں کی اواز بنی یہ اردو جدید ادب کا مطالعہ بھی رکھتے ہیں اور ان کی شاعری میں ن م راشد، ساحر لدھیانوی، فیض احمد فیض، اور بعض دیگر شعراء کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ سائل نے جن طبقات کے حق کے لیے جن طبقات کے خلاف تنقید کی ان طبقات کے بیچ وضاحت کا شعور رکھتے ہیں یہ شعور ایک سمبل بنا۔

سائل کی سوچ میں تضادات نظر آتے ہیں کیونکہ وہ انسانی حقوق کی بات کرتے ہیں مگر قوم پرستی کا احساس ان میں اتنا شدید ہے کہ وہ صرف پشتونوں کو مظلوم اور بے بس مانتے ہیں۔ یہ ان کی معصومیت ہے۔ سائل نے معاشرے کے برے رویوں اور خراب نظام کے خلاف حقائق کی روشنی میں اپنے انفرادی تجربوں کی سبب طویل نظمیں لکھی ہیں۔ معاشرتی برائیوں کی سب سے خطرناک دل دہلا دینے والی عکاسی ان کے نظموں میں نظر آتی ہے۔ بھوک، پیاس، خشک ہونٹ، اجڑے بال، مزدوری، محنت، جھونپڑے، ننگے، ضمیر فروشی، بھوکی ننگی مخلوق۔ فرقہ پرستی، ان کی نظم کے موضوعات ہیں۔ ان کے تشبیہات اور استعارات فرسودہ ہیں مگر پھر بھی جدت اور ندرت رکھتے ہیں۔ جذبوں کی خودسری طنز، اور گہری نفرت ان کی شاعری میں نظر آتی ہے۔ ان کے قلم نے وقت کے سیاستدانوں، حکمرانوں، پارٹی لیڈرز، سرمایہ داروں۔ اور جاگیرداروں کی وہ مذمت کی ہے جو سائل سے پہلے کسی اور نے نہیں کی۔ انکا انداز نظم واقعاتی اور رومانی ہے۔ اپنے خیال میں پشتون قوم پرست اور اشتراکیت کے علمبردار ہیں۔ ہیئت کے لحاظ سے ان کی نظمیں آزاد، معریٰ، اور پابند ہیں۔ ان کی زیادہ تر نظمیں قافیہ بند ہیں۔ اشتراکی نظریہ میں قومی اور بین الاقوامی نظریات کے حمایتی ہیں اور اسی طرح کے نظریاتی شخصیات کو پسند کرتے اور سراہتے ہیں۔ بے کس مظلوم مزدوروں کے لیے تاریخی اہمیت کی حامل نظمیں لکھیں۔ جن میں "ڈاکٹو ویتہ۔ والاڑہ گھڑی۔ ہیروشیما۔ پشاور، بم دھماکہ۔ اور دیگر جدید نظمیں ہیں۔ ان کی شاعری کے کئی مجموعے ہیں۔

"جدید نظم پہ پشتوکی" ص۔ 346-350

تحقیق کے چوتھے باب میں محترمہ سلمی شاہین نے اسلامیہ کالج پشاور اور ایڈورڈز کالج پشاور کے پشتون شعراء کی نظموں کا تنقیدی اور تحقیقی جائزہ لیا ہے۔ جس میں انگریزی ادب کے مطالعے کے بعد کی جدید پشتو نظم کے میدان میں معیاری تجربات ہوئے وہ لکھتی ہیں۔

"جدیدیت ایک دور کے ادب میں فکر اور مضامین کے لحاظ سے آنے والی تبدیلی کو کہتے ہیں مگر شعر و ادب میں تجربہ وہ شعوری کوشش اور تبدیلی ہے جس میں ہیئت یا فارم روایت کے لحاظ سے کیے جاتے ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں نئی ہیئتیں وجود میں آتی ہیں۔ وہ تبدیلی جس میں ساخت کے لحاظ سے روایات سے شعوری یا واضح انحراف نظر آئے تجربہ کہلاتا ہے۔

"جدید نظم پہ پشتوکی" ص۔ 359

ایوب صابر لکھتے ہیں" پشتو کے جو شعراء سب سے پہلے جدت اور تیکنیکی تجربوں کی طرف مائل ہوئے ان میں سید رسول رسا۔ فضل حق شیدا۔ غنی خان۔ ارباب ہدایت اللہ۔ محمد اشرف مفتون۔ یونس خلیل وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جنھوں نے پشتو ادب کو صدیوں پرانی ڈگر سے ہٹایا اس میں سانٹ، ازاد اور معریٰ نظموں کو داخل کیا اور آنے والی پود کو ایک راستہ دکھایا جو پشتو ادب کو معراج پر لے جانے والا تھا۔

"جدید نظم پہ پشتو کی" ص۔" 365.

محترمہ سلمیٰ شاہین رسا صاحب کے بارے میں لکھتی ہیں۔

"سید رسول رسا کو ہم جدید نظم کا معمار کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان سے پہلے کے شعراء خصوصاً نظم میں اس انداز کے نہیں تھے۔ جس طرح کا انداز رسا صاحب کا تھا۔ انہوں اظہار کی ازادی کے ساتھ ساتھ خیال کی ازادی بھی پیدا کی۔ فکر و نام کے حوالے سے یہ ابتدائی قدم بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے جدید نظم کو مغربی ادبیات اور دیگر زبانوں کی ادبیات کے مطالعے کی وجہ سے مغرب کا فکرو فلسفہ، رومانیت، حقیقت پسندی، مقصدیت، فطرت پرستی، ترقی پسند رجحانات کے ساتھ ساتھ ہیئت اور فارم کے نئے تجربے بھی کیے۔

"جدید نظم پہ پشتو کی" ص" 370

محترمہ سلمیٰ شاہین نے ازاد جدید نظم کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"مغربی ادبیات کے مطالعے سے متاثر ہونے کے بعد پشتو کے جدید نظم گو نامور شعراء نے شعوری طور پر پشتو نظم میں نئے نئے تجربے کیے۔ اس میں اسلامیہ کالج پشاور کے طالب علم کی حیثیت سے یونس خلیل کا نام بہت اہم ہے۔ پشتو کی جدید نظم میں اس کارواں کے ایک ممبر کی حیثیت سے وہ چھوٹے بحر کی معریٰ نظم اور فکر کے لحاظ سے سوز و گداز اور رومانی کیفیت کی کتنہ فکر کا ایک منفرد انداز رکھتے تھے۔ یونس خلیل صاحب عوام میں بہت مقبول تھے۔ سادہ انسانی جذبوں، پیار خلوص نے ان کی نظم کو تقویت دی۔

ان کا بیانیہ سادہ اور مترنم تھا ان کی ساری نظمیں معریٰ ہیں اور فکر وسعت
لیے ہوئے ہیں۔

"جدید نظم پہ پشتو کی 387 "ص۔

اپنی تحقیق کے حوالے سے محترمہ سلمیٰ شاہین کا بڑا نام ہے ان کی پی ایچ ڈی میں جدید
نظم کے سو سال محفوظ ہیں۔ اس تحقیق میں دو ملکوں کے پشتون شعراء کی جدید نظموں کا تنقیدی اور
تحقیقی جائزہ ہے۔ اس میں افغانستان اور پاکستان کے پشتون شعراء کی ایک صدی پر محیط تاریخ ہے۔
اس تحقیق اور تنقید نے درجنوں شعراء کو تاریخ میں محفوظ کیا، اس سلسلے میں وہ ایک مشہور شاعر
عبدالرحیم مجذوب کے حوالے سے لکھتی ہیں۔

"عبدالرحیم مجذوب نے پابند معریٰ اور آزاد نظمیں لکھی ہیں۔ انہوں نے نظموں میں
اپنی مرضی کے تجربات کیے ہیں۔ وہ سرمایہ دارانہ، جاگیردارانہ نظام اور طاقتور کے خلاف اور مظلوم
کے ہمدرد تھے۔ اپنے ہم عصروں میں الگ انداز کے مالک تھے اور یہ انداز ان کے اظہار اور لہجے کی
رومانیت ہے۔ ان کی نظم کا تسلسل، روانی، آہنگ اور وژن بہت دلچسپ اور فکر و فارم کے لحاظ سے

بہت جدید ہے۔

"جدید نظم پہ پشتو کی "ص۔" 398

محترمہ سلمیٰ شاہین نے تحقیق کے پانچویں باب میں لکھا ہے۔

"نئے دور کے نئے نوجوان شعراء جو دوسری زبانوں کی ادبیات کا مطالعہ بھی کرتے ہیں
اور جدید نظم کے حوالے سے کامیاب تجربوں کے سفر پر رواں دواں ہیں۔ ہم اگر اب تک کے پشتو
کی جدید نظم کے ادوار یا زمانے الگ الگ مکتبہ فکر میں تقسیم کرتے ہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس میں
ملیت، قامیت، مغربی رومانیت اور ترقی پسندی۔ نظم کے نمایاں موضوعات ہیں۔ ہیئت یا فارم کے
حوالے سے 1930 کے لگ بھگ نظم مکمل طور پر جدید نہیں تھی۔ مگر فکر و خیال اور موضوع کے
لحاظ سے اگرچہ جدید تھی مگر کلاسیکی پابند نظموں کے ساتھ کہیں کہیں عوامی رنگ بھی رکھتی تھی۔

1930 سے 1935 تک کے بعد جدید مغربی نظموں کا شمار بڑھا اور ساتھ ساتھ جدید
نظمیں بھی لکھی جانے لگیں۔ نئے دور کے نئے شعراء نہ صرف یہ کہ ادبیات کا مطالعہ کرتے ہیں
بلکہ عالمی ادب سے عالمی معیار کا ادب بھی تخلیق کرتے ہیں۔ جیسے ہم نے وضاحت کی ہے کہ ہر دور

کی جدیدیت دوسرے دور کی جدیدیت سے الگ معنی رکھتی ہے۔ اسی طرح نئے دور نظم گو گزرے زمانے کے نظم گو سے بہت مختلف ہوتے ہیں۔ نئی نسل کو بہت سے مواقع میسر ہیں۔ جس سے وہ مستفید ہوتے ہیں۔ ذرائع آمدورفت۔ کتب، رسائل اور اخبارات تک باآسانی رسائی۔ کتب کی اشاعت، ترسیل، اور عام تک رسائی۔ جدید تعلیمی نظام۔ کی وجہ سے مردوزن کو مساویانہ حقوق کا ہونا وغیرہ۔

"جدید نظم پہ پشتو کی" ص۔404۔

پروفیسر ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک محقق، دانشور، ادیب، و شاعر تھے۔ وہ پشتو اکیڈمی کے ڈائریکٹر بھی رہ چکے ہیں۔ محترمہ شاہین کے اچھے دوست اور کولیگ بھی رہے ہیں۔ ان کی جدید شاعری کے حوالے سے محترمہ سلمیٰ شاہین لکھتی ہیں۔ "جدید دور کے جدید نظم گو شعراء میں ہیئت اور تجربے کے لحاظ سے نظم میں نئے موضوعات اور نئے انداز کی وجہ سے ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک اپنے ہم عصر شاعروں میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔

1980 میں پشتو اکیڈمی نے اپنے مجلہ "پشتو" میں آزاد نظم کا تجرباتی نمبر شائع کیا۔ اس مجلہ میں پہلی بار ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک نے آزاد نظمیں ایسے انداز میں لکھیں، جس میں نظم کا اختتام ٹپہ پر ہوا تھا۔ اس نظم کے بارے میں ٹپہ ایز میں لکھا گیا ہے کہ "ٹپہ اور آزاد نظم میں تقابلی مشابہت کے ثبوت کے لیے پشتو کے ایک نوجوان شاعر اور ادیب راج ولی شاہ خٹک نے کچھ عرصہ پہلے اپنی نظم کا اختتام ٹپہ پر کیا تھا وہ نظم کچھ یوں تھا۔

یو آواز شی یو پیغام شی

د وطن هر یو زلمی ته

هر پښتون هر ننګیالی ته

د ملالۍ په خله وائی

که په میوند کی شهید نه شوے

خدائیګو لالیه بی ننګئی له دی ساتینه

ترجمہ: ایک آواز اور ایک پیغام بن جاتا ہے۔ وطن کے ہر نوجوان کے لیے۔ ہر غیرت مند پشتون کے لیے میوند کی ملالہ کے منہ سے کہلواتے ہیں۔ اگر میوند میں شہید نہیں ہوئے تو قسم ہے

میرے محبوب تمہیں تاریخ بے ننگ ونام رکھے گی۔۔

راج ولی شاہ خٹک کے اس کامیاب تجربے نے ایک دوسرے جوان شاعر سہیل خٹک کو اتنا متاثر کیا کہ اس نے ایسی آزاد نظمیں لکھیں جس کا اختتام بھی ایہہ پر ہوا تھا۔ شعری مجموعہ "ایہہ ایز" کے نام سے شائع کیا۔ راج ولی شاہ خٹک کی نظموں میں مخصوص فکر، پراسراریت، تجسس نے ان کی انفرادیت اور جدیدیت کو نمایاں کیا ان کی نظمیں۔ وقت۔ شاعر۔ تجدید۔ یاد۔ منزل۔ رومانی انداز۔ اور تجریدی رنگ ایسی نظمیں ہیں جس میں شعوری طور پر لفظی اور فکری ابہام نظر آتا ہے۔

"جدید نظم پہ پشتو کی" ص۔217-216۔"

محترمہ سلمیٰ شاہین اپنی ہم عصر شاعرہ، افسانہ نگار، ناول نگار، محترمہ حسینہ گل تمغہ امتیاز کی جدید نظم پر اپنے تحقیقی مقالے میں لکھتی ہیں۔

"جدید دور کے جدید تقاضوں کے حوالے سے جدید نظم کے شعراء میں حسینہ گل حقیقت میں ایک ایسی شاعرہ ہے جو نظم کی جدت کے تقاضے سے اچھی طرح واقفیت رکھتی ہے۔ حسینہ گل جو ہیئت اور فارم میں آزاد معریٰ نظم کی تخلیق کار ہے۔ اس کی نظموں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ حسینہ گل غزل بھی لکھتی ہے مگر نظم میں انفرادیت کی وجہ سے مقبول ہے۔ یہ زندگی کے جذبوں کی ترجمانی نظم کے موثر پیرائے میں کرتی ہے۔ جو کہتی ہے وہی اس کی زندگی اور محبت سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ یہ نظم میں فطری نسوانی جذبوں کا اظہار برملا کرتی ہے۔ یہ اپنے ماحول اور معاشرتی رویوں کی اچھی عکاسی کرتی ہے۔۔ حقیقت پسندی اور رومانیت، سادہ بیانیہ سے نظم کے پڑھنے اور سننے والوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جس چیز نے حسینہ کو دوسروں سے منفرد بنایا ہے وہ سادہ زبان اور محاورے کا صحیح استعمال ہے۔"

"جدید نظم پہ پشتو کی" ص" - 436۔

محترمہ سلمیٰ شاہین نے اپنی تحقیق کو نو حصوں میں تقسیم کیا ہے باب ششم میں جدید نظم کے حوالے سے جو بحث کی گئی ہے اس سے ایک اقتباس یہاں ضرور شامل کرنا چاہوں گی۔ اس میں دوسری زبانوں سے پشتو میں کیے گئے تراجم کو موضوع بحث بناتے ہوئے محترمہ شاہین لکھتی ہیں۔

"ادب میں جدیدیت کی طرف رجحان کا پہلا قدم انجمن پنجاب کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ محمد حسین ازاد اور ان کے دوستوں نے شعوری طور پر ادب کے لیے مقصدیت کو لازم و ملزوم ٹھرایا۔ اصلاح، مقصدیت، سنجیدگی، اور ازادی، اس وقت ادب کے موضوعات تھے۔ سر سید کی تعلیمی اور سیاسی تحریک نے شعروادب کو بھی متاثر کیا اور شعری ادب میں جدیدیت نے یہیں سے سفر شروع کیا۔ قومی تحریکوں نے غلامی سے ازادی کے لیے ولولہ انگیز نظمیں لکھیں جس نے پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پشتو زبان میں نئے Througts اور نئے اصناف بلاشبہ اردو سے آئے ہیں، مگر پشتو ادب اور پشتونوں نے انگریزی یا دیگر زبانوں کے اثرات بھی قبول کیے ہیں۔ اور اس وقت یہ براہ راست اثر قوی اور محکم نظر آتا ہے جب پڑھے لکھے تعلیم یافتہ پشتونوں نے یہ ادبیات پڑھنا شروع کیں۔ ابتدا میں تراجم کے ذریعے یہ افکار وخیالات لائے گئے اور پھر اردو کی وجہ سے جدید ادبیات پشتو میں ترجمہ ہوئیں۔ اسی طرح پشتو ادب نے جدت کا لبادہ اوڑھ لیا۔"

"جدید نظم پہ پشتو کی" ص۔ 485

محترمہ سلمی شاہین جدید نظم کی تاریخ کے حوالے سے لکھتی ہیں۔"پشتو کی جدید نظم میں علامہ اقبال نے جدید زمانے کو مد نظر رکھتے ہوئے قوم، وطن اور عوام کے لیے حقیقت میں وہ جذبہ ابھارا جو حقیقت میں مسلمانوں کی بیداری کے لیے ضروری تھا۔ وہ لکھتی ہیں" وہ پر خلوص اظہار جو حالی نے مسدس میں کیا۔ اقبال نے اپنے افکار میں بیان کیا۔ جو مسلمان قوم کی فطرت، قرآن کی تفسیر، مرد مومن کی خودی اور خودداری۔ فقر وقناعت، غنا، اور استغنا اور وہ سب جو مسلمانوں کے لیے ضروری تھا اپنایا۔ علم قرآن کو اپنے افکار میں منفرد انداز میں پیش کیا۔ اقبال کے افکار اعلی مقاصد پر مبنی تھے۔ لوگوں نے اس لیے انھیں سنا کہ ادب میں اس طرح کا پیغام پہلے کبھی نہیں دیا گیا تھا۔ شعر وشاعری کا میدان صرف عشقیہ مضامین، قدرت کے نظاروں کے لیے فارسی سے مستعار لیے گئے تھے۔ فارم، ہیئت یعنی قصیدہ۔ مخمس۔ مسدس وغیرہ مقبول تھے۔ جس کے موضوعات بھی پرانے تھے اور ہیئت بھی۔ لوگ۔ اس سے تنگ تھے کچھ نیا چاہتے تھے۔ حالی کی

مسدس اگرچہ نظم کے لحاظ سے ابتداء یا اغاز تھی۔ مگر علامہ اقبال کی شاعری تمام مسلمانوں کے لیے اسلامی افکار و تفسیر تھی۔ نہ صرف اسلامی افکار بلکہ مغربی فلسفے سے آگاہی بھی تھی اور اس طرح پشتو میں جدید نظم سے تراجم کا سلسلہ چل نکلا۔ علامہ اقبال کا شکوہ جواب شکوہ۔ دوسری ایسی نظم تھی جس پر پشتونوں نے توجہ دی اور حقیقت میں اس پر سوچا۔ اس کا پشتو ترجمہ راحت زاخیلی نے کیا تھا اور دو بار یونیورسٹی بک ایجنسی نے اسے شائع بھی کیا۔

"جدید نظم پہ پشتو کی" ص۔489۔

محترمہ سلمی شاہین کی تحقیق کا ساتواں باب "جدید نظم کا مستقبل" کے عنوان سے ہے، اس حصے سے ایک پیراگراف شامل کرنا چاہوں گی۔ محترمہ شاہین لکھتی ہیں۔

> "وقت کی اتنی بڑی افاق میں آگے بڑھنے کے راستے آسان ہوئے ہیں۔ اسلوب اور انداز کے لیے بھی اور اپنی انفرادیت کے لیے بھی۔ جدید نظم میں لکھنے والوں کے لیے یہ امکان پیدا ہو گیا ہے کہ جو شاعر نام اور مقام کا مالک ہو گا، جو عالمی ادب میں مقابلے کے لیے کوئی نئی چیز تخلیق کرے گا یہی جدیدیت کے تقاضے کو اپنا کر رخ بدل دے گا۔ یہ شاعری کی پہلی علامت سمجھی جائے گی۔ کیونکہ پشتون نے شعور میں کمال حاصل کیا ہے اور وہ دنیا کے ساتھ برابری میں قدم اٹھا سکتا ہے۔ زندگی کے رنگ بدل سکتا ہے۔ فکر و فن کی دنیا میں نئے تصورات لا سکتا ہے۔ بہت سارے وہ تصورات جو کلاسیکی اصناف میں موزوں تھے مگر نئے خیالات و تصورات میں عصری شعور کے تقاضے اس میں نہیں سما سکتے تو یہ یقینی ہے کہ یہ جدید نظم کے موضوعات ہیں۔ یہاں پیار و محبت۔ حسین زلفیں۔ کالی اور سبز آنکھیں وغیرہ اصطلاحات کے محتاج ہیں۔ پھر تلوار اور تلوار بازی نئے آلات جنگ و ساز و سامان میں بدلتے ہو گئے۔ انسانیت کا ہمہ گیر احساس نئے معنی میں تبدیل ہو گا۔ پیار و محبت کے نئے رنگ۔ بود و باش کے نئے انداز۔ جدت کے نئے رنگ۔ آزمائشوں کے نئے تجربے۔ ماحول کی نئی حقیقتیں۔ یہ ساری تبدیلیاں نظم کے موضوعات اور ہیئتوں کو تبدیل کرتی ہیں۔ کیونکہ ادب زندگی کا عکس اور اپنے ماحول کا

ترجمان ہوتا ہے۔ اپنے دور اور عصر پہ تقاضہ۔ اس دور کی سیاسی، معاشرتی
نفسیاتی معاشی جغرافیائی اور تاریخی حالات کی تابع ہوتی ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں
کہ شاعری کی دنیا میں مستقبل، جدید نظم کی جدید کی ہیئت یا نیا فارم ہے جو
پڑھنے اور سننے والوں کو نئی فکر نیا خیال، نیا پیرایہ اور نئے انداز کی طرف لاتی
ہے اور بلاشبہ جوانوں میں یہ استعداد اور صلاحیت موجود ہے۔"

"جدید نظم پہ پشتو کی" ص۔" 500

محترمہ سلمیٰ شاہین کی تحقیق کا نواں اور آخری باب "افغانستان میں جدید نظم" پر ایک طائرانہ جائزہ کے عنوان سے ہے۔ اس حصے میں انہوں نے ان تمام افغان نظم گو شعراء کی جدید نظموں پر بات کی ہے جو اس میں نمایاں مقام رکھتے ہیں ان شعراء میں غلام محی الدین افغانی۔ عبد العلی مستغنی۔ عبد الہادی داوی۔ عبد الواسع قندھاری۔ گل باچا الفت۔ عبد الحی حبیبی۔ عبد الروف بینوا۔ صدیق اللہ ریشتین۔ قیام الدین خادم۔ عبد الشکور رشاد۔ سلیمان لائق۔ عبد الباری جہانی۔ مجاور احمد زیار۔ صفیہ صدیقی۔ پیر محمد کاروان۔ کی جدید نظموں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس تحقیق میں ایک صدی کے سو شاعر ہیں جن کی جدید نظم پر محترمہ سلمیٰ شاہین نے تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اسی طرح پشتو جدید نظم کے سو سال محفوظ ہوئے ہیں جس سے مستقبل کے محققین کو بلاشبہ فائدہ ہو گا۔

"جدید نظم پہ پشتو کی" ص559۔

سلمیٰ شاہین کا ایک اور تحقیقی کام پشتو ٹپے پر ہے۔ انہوں نے اس عوامی صنف کے فکری اور فنی پہلوؤں پر تحقیقی مضامین لکھے اور شائع کیے۔

****

باب ہفتم

سلمیٰ شاہین کی تصانیف

سلمیٰ شاہین نے نظم و نثر میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جن کا تعارف ذیل میں دیا جاتا ہے۔
پختو ٹپہ معاشرتی او ثقافتی اثر "(پشتو ٹپے پر معاشرتی اور ثقافتی اثرات)
اس کتاب میں پشتو ٹپے کے عمرانی پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ کتاب ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ٹپے کے تعارف کے ساتھ اس میں پیش کیے جانے والے مضامین سے مفصل بحث کی گئی ہے۔

روھی سندرے

یہ کتاب دو جلدوں پر مبنی ہے۔ اس میں پشتو ٹپوں کی تدوین کی گئی ہے۔ ٹپہ چونکہ ایک لوک صنف ہے اس لیے اس کتاب میں لوک ادب کی اہمیت، اس میں استعمال ہونے والی آسان اور عوامی زبان اور عوامی دانش سے بھی بھرپور بحث کی گئی ہے۔ ٹپوں میں اخلاقیت، لطیف انسانی جذبات و احساسات، توہمات اور ہندو تہذیب کے اثرات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

پشاور شہر اور روایات

یہ کتاب دسمبر ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں پشاور شہر کی تاریخ، رسم و رواج، لوک گیت، قدیمی بازاروں، تاریخی عمارتوں، دروازوں، مزارات، اور باغات کا ذکر کیا گیا ہے۔ پشاور شہر سے متعلق بعض عالمی مورخین کی آرا اور جائزے بھی اس میں شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب میں اس شہر کے طرز تعمیر، یہاں کی ثقافت، موسیقی، شاعری، رسومات، ملبوسات وغیرہ سے متعلق بھی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

باب ہفتم

سلمیٰ شاہین کی تصانیف

سلمیٰ شاہین نے نظم و نثر میں کئی کتابیں تصنیف کی ہیں جن کا تعارف ذیل میں دیا جاتا ہے۔

پہ پختو ٹپہ معاشرتی او ثقافتی اثر "(پشتو ٹپے پر معاشرتی اور ثقافتی اثرات)

اس کتاب میں پشتو ٹپے کے عمرانی پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ کتاب ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی۔ اس میں ٹپے کے تعارف کے ساتھ اس میں پیش کیے جانے والے مضامین سے مفصل بحث کی گئی ہے۔

روہی سندرے

یہ کتاب دو جلدوں پر مبنی ہے۔ اس میں پشتو ٹپوں کی تدوین کی گئی ہے۔ ٹپہ چونکہ ایک لوک صنف ہے اس لیے اس کتاب میں لوک ادب کی اہمیت، اس میں استعمال ہونے والی آسان اور عوامی زبان اور عوامی دانش سے بھی بھرپور بحث کی گئی ہے۔ ٹپوں میں اخلاقیات، لطیف انسانی جذبات و احساسات، توہمات اور ہندو تہذیب کے اثرات کی بھی نشاندہی کی گئی ہے۔

پشاور شہر اور روایات

یہ کتاب دسمبر ۲۰۰۷ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس میں پشاور شہر کی تاریخ، رسم و رواج، لوک گیت، قدیم بازاروں، تاریخی عمارتوں، دروازوں، مزارات، اور باغات کا ذکر کیا گیا ہے۔ پشاور شہر سے متعلق بعض عالمی مورخین کی آرا اور جائزے بھی اس میں شامل کیے گئے ہیں۔ کتاب میں اس شہر کے طرز تعمیر، یہاں کی ثقافت، موسیقی، شاعری، رسومات، ملبوسات وغیرہ سے متعلق بھی معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

تور سرے (عورت)

یہ کتاب ۲۰۰۵ء میں شائع ہوئی ہے۔ کتاب میں پشتون روایات، ثقافت، مخصوص طرزِ معاشرت اور اخلاقی نظام کو اجاگر کیا گیا ہے۔ پشتونوں کے جذباتی انداز اور جوشیلے پن کی نفسیات، پشتون عورت کی نفسیات اور ان کے جمالیاتی و ادبی ذوق اور پشتو ٹپے کی تخلیق میں خواتین کے کردار کو بھی نمایاں کیا گیا ہے۔ پشتو ٹپہ میں پشتون عورت کی حقیقی زندگی، نفسیات، معاشرتی رویوں اور معاشرتی ڈھانچے کو سمویا گیا ہے۔ پشتون معاشرے میں جنگوں کا خاتمہ اور امن و سکون عورت ہی کے مرہونِ منت ہے۔ کتاب میں عورتوں کے حوالے سے دیگر کئی شعراء کی نظمیں بھی شامل کی گئی ہیں جن میں فضل حق شیدا، سید رسول رسا، غنی خان، عبدالرحیم مجذوب، اجمل خٹک، پریشان خٹک، قمر راہی، ثریا حوا، زیتون بانو، راحت زاخیلی، شاہ خٹک، صفیہ صدیقی، ہاشم بابر، عنایت اللہ ضیاء، حسینہ گل، میجر الطاف خٹک، قاضی حنیف اللہ اور عمر فاروق کی نظمیں شامل ہیں۔

****

باب ہشتم

سلمٰی شاہین بطور انتظامی افسر

سلمٰی شاہین نے ۲۰۰۲ میں پی ایچ ڈی مکمل کی اور ۲۰۰۳ میں پشاور یونیورسٹی کی پشتو اکیڈمی کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے تعینات ہوگئیں۔ اس عہدے پر آکر انہوں نے پشتو زبان و ادب کی ترقی اور اشاعت کے لیے بہت محبت سے ذمہ داریاں نبھائیں۔ ان ہی کے دور میں پشتو اکیڈمی سے منسلک پشتو کلچر میوزیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ پشتو اکیڈمی پشتو یونیورسٹی آف پشاور کا ایک ذیلی ادارہ ہے جس کا قیام ۱۹۵۵ میں عمل میں لایا گیا۔ اکیڈمی نے پشتو میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے پروگرام شروع کیے جو کامیابی سے جاری ہیں۔ سلمٰی شاہین نے بطور ڈائریکٹر اس ادارے کی ترقی کے لیے دن رات کام کیا۔ ان کو ان کے کام کے سبب سب ہی کا احترام حاصل رہا۔ ڈاکٹر فرخندہ لیاقت نے سلمٰی شاہین سے متعلق لکھے گئے ایک مضمون میں ان کے لیے یہ ٹپہ درج کیا ہے کہ:

که لوئی کړم داسره خائی

یوه خائسته یم بل د لویه کوره یم

ترجمہ: اگر میں بڑائی کا اظہار کرتی ہوں تو بجا کرتی ہوں کہ ایک تو میں حسین ہوں اور دوسرا یہ کہ بڑے گھرانے سے ہوں۔

وہ بے شک بڑے گھرانے کی ہیں لیکن ان کو ہر خاص و عام میں عزت اور احترام ان ان کی مسلسل جدوجہد اور سنجیدگی سے اپنی ذمہ داریاں نبھانے پر ملی۔ خواتین کی عزم و ہمت اور جہد مسلسل کا استعارہ ہیں۔ شاعرہ، نقاد، محقق ناول نگار اور افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین منتظمہ بھی رہی ہیں۔ پشتو اکیڈمی کو امریکہ سے مالی مدد ملی تو انہوں نے کتب خانے کی ہزاروں کتابوں کو کمپیوٹرائز کرنے اور قلمی نسخوں کو محفوظ بنانے پر یہ رقم خرچ کی۔ لوک ورثہ اسلام آباد سے پشتو اکیڈمی کے لیے کلچر کے حوالے سے کئی پراجیکٹ بھی سلمٰی شاہین کی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ انہوں نے ڈائریکٹر کی حیثیت سے اکیڈمی کی طرف سے بعض کتابوں کی اشاعت کا

اہتمام کیا۔ ان میں پروفیسر افضل رضا کی تالیف "پنزہ شمے "(پانچ شمعیں)۲۰۰۶ میں شائع ہوئی۔ اس میں پانچ نمائندہ شاعرات کا تعارف اور کلام ہے۔ عظمت ہما کا ایم فل کا تحقیقی مقالہ "اردو اور پشتو کے نمائندہ افسانے "۲۰۰۵ میں شائع کیا۔ پشتو کتابوں کی فہرست پروفیسر افضل رضا اور شہلا امیر نواز نے مل کر ۲۰۰۶ میں مرتب کی۔ پروفیسر داور خان داؤد کی کتاب "خوشحال خان اور فوکلور "۲۰۰۶ میں، پروفیسر قابل خان کی انگریزی کتاب "حمزہ کی زندگی اور کلام "۲۰۰۶ میں اور پروفیسر نواز طائر کی خود نوشت "ادب تراش "۲۰۰۶ میں شائع ہوئیں۔ اس دور میں تراجم کو بھی خصوصی توجہ دی گئی۔ پروفیسر طٰہٰ خان کا رحمان بابا کی کلیات کا منظوم اردو ترجمہ شائع ہوا۔ ایک کتاب "زنجیر" کے نام سے شائع ہوئی جس میں پشتو کے پانچ ادیبوں کے فن سے تنقیدی بحث کی گئی ہے۔ محمد نواز طائر کی کتاب "روہی سندرے "کی دوبارہ اشاعت ۲۰۰۶ میں کی گئی۔ ڈاکٹر خالد خان خٹک کا پی ایچ ڈی مقالہ "سندھی پشتو اردو روابط "۲۰۰۷ میں شائع کیا گیا۔ پروفیسر پریشان خٹک کی کتاب "پشتون کون "کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا گیا۔ ڈاکٹر پرویز مہجور کا پی ایچ ڈی مقالہ "دارزانی خوشکی کلیات "۲۰۰۵ میں شائع ہوا۔ ہمیش خلیل کی کتاب "دچار بیتے شاعران "شائع کی گئی۔ ڈاکٹر قابل خان کی کتاب "پشتو فوکلور "، مشرف خان کی انگریزی کتاب THE IMPECT& INFLUENCE ACROSS THE KHYBER، ڈاکٹر پرویز مہجور کی کتاب "شعریات منتخبیں "، محمد جاوید خلیل کی تحقیقی کتاب پشتو کی منظوم داستانیں "، ڈاکٹر سلمیٰ شاہین کی کتاب "پشتونوں کی موسیقی کے آلات "، ہمیش خلیل کی تالیف "جنگی چار بیتے " اور ڈاکٹر راجولی شاہ خٹک کی کتاب "پشتو ولی "، ہمیش خلیل کی کتاب "دچار بیتے علاقائی شاعران "، سلطان سیفور کی کتاب "عوامی شکار اور اس کے طریقے "، ثقلین بنگش کی کتاب "عوامی شعرا"، نادر شاہ شنواری کی تصنیف "جرگہ "، نثار محمد خان کی کتاب "آہنگ کوہسار "، ڈاکٹر حنیف خلیل کی کتاب "پشتون قبیلے اور ان کے لہجے "، پروفیسر طٰہٰ خان کا خوشحال خان کی رباعیات کا منظوم ترجمہ، عبداللہ جان عابد کا پشتو محاورات پر ایم فل کا تحقیقی مقالہ، قاضی حنیف اللہ کی تصنیف "احمد شاہ ابدالی ژوند او فن "، اور خوشحال خان کی دو کتابوں "باز نامہ " اور " دستار نامہ " کے انگریزی تراجم جو ڈاکٹر عارف نسیم نے کیے ہیں۔ اس دوران مرزا جہانزیب یار کا پشتو ناول "گل مینہ " بھی شائع کیا۔ اس وقت کئی ادیب معترض تھے کہ پشتو اکیڈمی تو ایک تحقیقی ادارہ ہے۔ اس کی طرف سے ایک ناول کی اشاعت مناسب نہیں ہے۔ اس اعتراض کا

جواب سلمٰی شاہین نے پہلے ہی ناول کے پیش لفظ میں دے دیا تھا کہ پشتو اکیڈمی پشتون کلچر، زبان و ادب کی امین ہے جہاں میں برصغیر کی کم و بیش تین سو سالوں پر محیط تاریخ، ثقافت اور پشتو زبان و ادب کا اصل رنگ موجود ہے۔ نئی نسل کے لیے پرانے وقتوں کی معاشرت، رسم و رواج، عقائد اور طرزِ معاشرت کو محفوظ کرنا اور ان تک پہنچانا مقصود تھا۔ ادب، تاریخ، ثقافت اور ارکیالوجی کے طالب علم اس سے استفادہ کریں گے۔ اپنے کلچر کی تین صدیوں کو محفوظ کرنا میرا فرض تھا۔

پشتو اکیڈمی میں کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ وہ کانفرنسوں اور سیمیناروں کا انعقاد بھی کرتی رہیں۔ ۲۰۰۳ سے ۲۰۰۹ تک اپنے پانچ سالہ دور میں انہوں نے سات کانفرنسز اور سیمینار کروائے۔ جن میں ۲۰۰۳ میں باڑہ گلی میں انٹرنیشنل سیمینار بعنوان "پشتو زبان میں تحقیق اور تخلیقی ادبی جمود" اہم سیمینار تھا۔ ۲۰۰۴ میں عبد الرحمان بابا کانفرنس، ۲۰۰۵ میں پشتو زبان کا مستقبل کے عنوان سے سیمینار، ۲۰۰۵ میں پشتون کلچر سیمینار شامل ہیں۔

سلمٰی شاہین نے اپنی منصبی ذمہ داریاں پورے عزم و حوصلے کے ساتھ نبھائی ہیں۔ وہ پشتون معاشرے کی اقدار کو خوب جانتی تھیں اور ان کو خوب نبھایا ہے۔ پشتون معاشرے کی کچھ اقدار کو نبھانا آسان بھی نہیں ہے پشتو صرف ایک زبان کا نام ہی نہیں بلکہ اس قوم کا ایک سماجی دستور اور منشور بھی ہے۔ ایک ضابطۂ حیات ہے جس پر کاربند رہنے والے ہی کو پشتون مانا جاتا ہے۔ اس دستور میں خواتین کو احترام حاصل ہے۔ خواتین کا بالمقابل آنے اور یا ان کا راستہ روکنے کو برا خیال کیا جاتا ہے۔ سلمٰی شاہین ان اقدار سے خوب واقف تھیں چنانچہ ان اقدار کی روشنی میں پورے اعتماد اور عزم کے ساتھ اپنے پیشہ ورانہ فرائض بھی بطریقِ احسن ادا کیے اور تصنیف و تالیف کے کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ہارون رشید خٹک نے اپنی تصنیف "جدید دور کی پشتون شاعرات" میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ بطور ڈائریکٹر سلمٰی شاہین کا زمانہ ایک زریں دور کہلاتا ہے۔ ان کے دور میں پشتون کلچر میوزیم کی تعمیر کا آغاز ہوا۔ اس تعمیر میں پراجیکٹ ڈائریکٹر کے لیے سات ہزار ماہوار معاوضہ مقرر تھا اور میوزیم پانچ سال میں مکمل ہونا تھا۔ سلمٰی شاہین نے یہ لاکھوں روپے وصول نہیں کیے۔ اس رقم سے انہوں نے میوزیم کے لیے فرنیچر خریدا۔

****

باب نہم

تاثرات

پروفیسر ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک

پروفیسر ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک نے سلمیٰ شاہین کی شخصیت اور فن سے متعلق اپنے تاثرات ان کے شعری مجموعے "رابیل" میں قلم بند کیے ہیں اور لکھا ہے:

"محترمہ سلمیٰ شاہین گزشتہ پندرہ برس سے پشتو اکیڈمی میں تحقیق کر رہی ہیں۔ ایک ساتھی تنقید نگار اور اور محقق کی حیثیت سے میں اس کی ذہنی اور فن کارانہ صلاحیت سے واقف ہوں۔ سلمیٰ جب بھی کبھی نظم یا نثر میں کچھ تخلیق کر لیتی ہیں تو سب سے پہلے مجھے تنقیدی جائزے کے لیے دیتی ہیں۔ اس طرح ان کا فنی ارتقا مجھ پر عیاں ہے۔ سلمیٰ نے پشتو ٹپہ پر کام کیا ہے اور کم و بیش تیس ہزار ٹپے جمع کیے ہیں اور دو جلدوں میں شائع کیے ہیں۔ ٹپے کے مضامین کی درجہ بندی اور تہذیب پر اس کے اثرات کے حوالے سے تحقیقی مضامین بھی لکھے ہیں۔ سلمیٰ کے اشعار میں داخلیت کا اظہار ہے۔ وہ پہلی پشتون شاعرہ ہے جس نے داخلیت کے اظہار، اور اس کے جمالیاتی ادراک میں جرات دکھائی ہے۔ ان کی نظمیں رجائیت اور قنوطیت کا حسین امتزاج ہیں۔ کبھی وہ اس تجرید کو پہنچ جاتی ہے جس میں منزل کا ڈھونڈنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ بات درست ہے کہ اس کے اشعار میں نسوانیت نمایاں ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ سلمیٰ اپنی ذات اور پشتون احساس کی پشتون شاعرہ ہے۔"

پروفیسر ڈاکٹر یار محمد مغموم

پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین منفرد انداز کی شاعرہ اور نثر نگار ہیں۔ وہ مردان کی مردم خیز مٹی سے تعلق رکھنے والی شعر و ادب کے میدان میں جانی پہچانی شخصیت ہے۔ اپنے ہم عصر لکھاریوں پر قلم اٹھانا تو مشکل ہوتا ہے اور اس وقت کچھ اور بھی دشوار ہو جاتا ہے جب لکھاری

کلاس فیلو اور ساتھی بھی ہو۔ میں سلمیٰ شاہین کو پچھلے چالیس سال سے جانتا ہوں۔ اور مجھے ان کی شاعری کے تمام رنگوں سے شناسائی ہے۔ وہ صرف اس وجہ سے قابل احترام نہیں کہ وہ ایک اچھی شاعرہ، افسانہ نگار، ناول نگار اور محقق ہے بلکہ اس وجہ سے بھی کہ علاقائی اور بین الاقوامی سطح پر پشتو زبان کی ببانگ دہل وکالت کرتی نظر آتی ہے۔ ادبی میدان میں پشتو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے خواتین کی نمائندگی کا حق ادا کر رہی ہیں۔ وہ صرف اس لیے عزت کی حق دار نہیں ہیں کہ پشتو اکیڈمی جیسے باوقار ادارے کی ڈائریکٹر رہی ہیں بلکہ اس وجہ سے بھی باوقار، محترم اور اعلیٰ مقام رکھتی ہیں کہ پشتو زبان و ادب کی ترقی کے لیے پشتو اکیڈمی کو ایک بامقصد ادارہ بنانے کی خاطر ایمان داری سے جو فعال کردار ادا کیا۔ اور اس کی اصلی اور بنیادی حیثیت بدلنے کے لیے جو اقدام ہوا اس وقت انہوں نے بہت بہادری اور جرات سے اس اقدام کو ناکام بنایا۔ اکیڈمی کی بحالی کے لیے ہر قسم کے خطرے سے بے پرواہ ہر محاذ پر مقابلہ کیا اور کامیاب ہوگیں۔ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ پشتو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کی خاطر اکیڈمی کے لیے مقرر کردہ فنڈ میں انہوں نے کوئی بھی خیانت نہیں کی ہوگی۔ میوزیم، پشتو کلچر ہال اور دیگر مطبوعاتی اور تعمیراتی کام ان کی ایمان داری کا ثبوت ہیں۔ انہوں نے جو کام کیے اس سے پہلے کسی ڈائریکٹر نے انجام نہیں دیے۔

سلمیٰ شاہین بنیادی طور پر شاعرہ ہیں۔ اور ان کی شاعری میں رومان غالب ہے۔ شاعری میں انہوں نے اپنی جرات اور داخلیت کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ اپنی شاعری میں عورت کے مسائل اور طبقاتی کشمکش کو رومانی انداز میں جگہ دی ہے۔ داخلی جذبات کے ساتھ قومی جذبات بھی ایسے پیرائے میں بیان کیے ہیں کہ پشتو زبان، ثقافت اور قوم کے ساتھ ان کا پیار اور خلوص صاف نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں پسے ہوئے طبقے کی محرومیوں کے بیان میں قنوطیت میں رنگی ہوئی ہے ورنہ باقی شاعری قومی مستقبل کا روشن استعارہ لگتی ہے۔ قوم کی ایک ذمہ دار شاعرہ کی حیثیت سے ان کی شاعری میں اصلاح کا رنگ اور منافقانہ رویوں کی مذمت ہے۔ ہیئت کے لحاظ سے سلمیٰ کی شاعری غزلوں، پابند نظموں اور آزاد نظموں پر مشتمل ہے۔ ان تمام اصناف میں زبان کی شیرینی اور روانی ہے اور ہر قسم کے ابہام سے پاک ہے۔ ان کی رومانی شاعری کے موضوعات میں ایک موضوع ماضی کا تذکرہ بھی ہے۔ مختلف رومانی شعراء نے گزشتہ دور کے تلخ و شیریں یادیں بیان کی ہیں۔ شاعری کی چار کتابوں کے علاوہ تحقیقی میدان میں بھی ان کی خدمات قابل قدر ہیں۔ شاعری

اور تحقیق کے علاوہ افسانہ اور ناول میں بھی قدم رکھا ہے۔ شاعری میں جو نرم و شیریں اور رومانی لہجہ استعمال کیا ہے ناول اور افسانوں میں بھی یہی زبان استعمال کی ہے۔ اس لحاظ سے تردد کیے بنا یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ محترمہ سلمیٰ شاہین ایک صاحب طرز شاعرہ اور نثر نگار ہیں۔ اور اسی لیے اپنے منفرد مقام اور خدمات کی وجہ سے حکومت نے انہیں تمغہ امتیاز جیسا بڑا اعزاز دیا ہے۔"

مشہور شاعر و ادیب رحمت شاہ سائل نے اپنی ایک کتاب "د پښتو شاعرئ آئینه" میں محترمہ سلمیٰ شاہین کے دوسرے شعری مجموعے "زړه له عقشي وژړه دے" پر اپنا ایک مقالہ شامل کیا ہے۔ اس میں وہ محترمہ سلمیٰ کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

سلمیٰ اپنے ہم عصر شاعرات میں عمر میں کسی سے بڑی اور کسی سے چھوٹی ہیں۔ جیسے محترمہ سیدہ بشریٰ بیگم۔ زیتون بانو۔ الف جانہ خٹک۔ فوزیہ انجم وغیرہ یا پھر حسینہ گل۔ جمیلہ بلال۔ بیلا اپریدئی وغیرہ مگر ان سب میں سلمیٰ کا ایک الگ اور منفرد مقام ہے اگرچہ خواتین ادبی میدان میں آسانی سے نہیں آئیں انہوں نے بہت قربانیاں دی ہیں۔ سلمیٰ کے لیے بھی یہ آسان نہیں تھا اس نے اپنی ہم عصر شاعرات کی قربانیوں کی روایت کو زندہ رکھا ہے

اور اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق جدت کے دروازے بھی کھولے۔ سیانے کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے پس منظر میں اپنی قتل گاہوں کا ادراک بھی کرنا چاہیے کیونکہ یہ روشنیاں مفت میں نہیں ملی۔ "پھول کے حسن کو ہم محسوس تو کر سکتے مگر ضروری یہ ہے کہ پھول کے کھلنے کی تکلیف اور درد کا اندازہ بھی ہم کر سکیں۔ سلمیٰ کو بہت ساری چیزیں وراثت میں ملی۔ پھر نوکری بھی اس ادارے میں کی جہاں مردوں کی اکثریت تھی اس نے بھی بہت کچھ سہا ہوگا۔ مگر اس نے پرواہ کی اپنا ریسرچ اور اس کے ساتھ تخلیقی کام جاری رکھا۔ سلمیٰ نے اگرچہ اپنی تحریروں میں بے باکانہ اظہار کیا ہے مگر اس فن پارے میں اس نے اپنے سر سے دوپٹہ نہیں اترنے دیا۔

میں بذات خود شاعری میں مرد اور عورت کی تفریق نہیں، مانتا مگر ہمارے معاشرے میں جب خاتون تخلیق کار جنم لیتی ہے تو وہ اتنی جرات نہیں کر سکتی کہ وہ جو شاعری کرتی ہے اس کا برملا اظہار بھی کرے۔ اور اگر جرات کرکے وہ کہتی بھی ہے تو پھر معاشرہ اس کے سامنے ہوتا ہے۔ صرف گھر کی پابندیاں نہیں ہوتیں۔ کیونکہ مرد ہمارے معاشرے کا ناز و نخرہ ہے اور خاتون حیا دار

اور باوقار قیدی۔

خوشحال خان سے لے کر غنی خان تک سب نے اپنے عشق کا بے باکانہ اظہار اپنی شاعری میں کیا ہے۔ لیکن اگر کوئی خاتون اس کا اظہار کرے تب ہماری نفسیات کو کچھ ہونے لگتا ہے۔ سلمیٰ کی شاعری خاموش شور سے نکلی ہے۔

"زڑہ د ابراہیم کڑہ کہ سوک ظلم د نمرود کوی
سوزہ خو پہ خلہ د سوزیدو خبری مہ کوہ۔

ترجمہ۔ اگر کوئی نمرود بن کر ظلم کرے تو تم ابراہیم بن کر جلتا جا۔ اور زبان پر جلن کا نام مت لا۔"
میں ہر پشتون شاعرہ کے ساتھ سلمیٰ کو عظیم مانتا ہوں کیونکہ اگر اس نے روایات کی پاسداری کی ہے تو نئے اور تازہ جذبوں کو پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ سلمیٰ کی اس کتاب کے لیے میں روایتی بول نہیں بولوں گا۔ کہ پشتو ادب کی دولت میں ایک اور خزانے کا اضافہ ہوا ہے۔ مگر میرے خیال میں اس کتاب کا مقام ضرور ہونا چاہیے۔

محترم ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک نے محترمہ سلمیٰ شاہین کی شاعری کی کتاب "زوند عفسی وژہ وے" کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"محترمہ سلمیٰ شاہین اس وجہ سے بھی قابل تعریف اور داد کی مستحق ہیں کہ غالباً یہ ہمارے عصر کی پہلی خاتون شاعرہ ہیں جس نے داخلیت کی اظہار کی جرات کی ہے۔ ان کی نظموں میں اکثر یہ احساس دکھائی دیتا ہے جس کا عام طور پر اظہار کرنا مشکل ہوتا ہے مگر فنکارہ کے ساتھ جو زبان ہے وسیلہ ہے اس کے استعمال کرنے کا فن وہ خوب جانتی ہیں۔ میں مانتا ہوں کہ وہ ساری کیفیات جس میں مجھے احساس برتری نظر آتی ہے، ہو سکتا ہے یہ سلمیٰ کے دور کی ہر پشتون لڑکی کا نفسیاتی اثاثہ ہو کیونکہ اگر باقی پشتون لڑکیاں اپنے دلوں کا حال شادی بیاہ کے رسوم یا گیتوں میں بیان کرتی ہیں غالباً اسی طرح کا احساس اور رنگ و جذبات باقی بہنوں کے ساتھ مشترک ہوں۔ مگر بات فن کی ہے علم کی ہے اور جرات کی ہے اور میں نے شاہین کے فن میں یہ جرات دیکھی ہے۔

"ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک۔ زوند عفسی وژہ وے۔"

ہمیش خلیل ہمارے بزرگ محقق، ادیب، شاعر، ہیں انہوں نے "پختانہ لیکوال" تیسری اشاعت

2011 میں محترمی سلمیٰ شاہین کے بارے میں ایک چیپٹر لکھا ہے اس سے اقتباس یہاں شامل کر رہی ہوں یہ وہ تاثرات ہیں جو محترم خلیل نے ان کی شاعری سے پہلے پیراگراف میں شامل کیے ہیں وہ لکھتے ہیں۔

"سلمیٰ شاہین مردان تحصیل بغدادہ نامی گاؤں امیر محمد خان کے گھر 16 اپریل 1954 میں پیدا ہوئیں۔ میٹرک گرلز ہائی سکول مردان۔ ایف اے۔ بی اے۔ گورنمنٹ گرلز کالج مردان

بالترتیب- 75 - 1973 - 1972 - 1971

میں کیا۔ ایم اے پشتو اور جدید نظم پہ پشتو کی۔ پی ایچ ڈی پشاور یونیورسٹی سے سال 1978 اور 2000 میں کی۔ سال 1978 میں پشاور یونیورسٹی پشتو اکیڈمی میں بطور جونئیر ریسرچ افیسر ملازمت کرنے لگی۔ پھر تدریجی ترقی کرکے یکم جولائی 2004 سے 2009 تک پشتو اکیڈمی میں بطور ڈائریکٹر کام کیا۔ 2006 میں پشتون کلچرل میوزیم کی بنیاد رکھنے کا سہرا بھی اس کے سر ہے۔ اپنی ادبی خدمات کی وجہ سے سال 2008 میں انھیں صدارتی ایوارڈ تمغہ امتیاز سے نوازا گیا۔ مختلف ادبی حلقوں سے بھی وقتاً فوقتاً ایوارڈ ملتے رہے۔ تحقیق اور اشاعت کے حوالے سے پشتو اکیڈمی میں ملازمت کے دوران جو کام ہوا ہے وہ بطور ڈائریکٹر پشتو اکیڈمی اور اس کے علاوہ بھی بہت بھاری ہے۔ سلمیٰ شاہین ایک محقق، شاعرہ، اور ناول نگار کی حیثیت سے پشتون خواتین تخلیق کاروں میں ایک بڑا نام ہے۔ پشتو ادب کی ہر صنف میں فنی تقاضوں کا خیال رکھا ہے۔ اور اپنی تئیں کوشش کی ہے۔ بعض حقیقتوں کو اپنے ادبی افکار میں خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اپنے ادبی کام اور اس کی صداقت سے سلمیٰ نے ادبی پرواز کو جو حرمت بخشی ہے وہ شاہین کی پرواز ہے۔

"بخش خلیل۔پختانہ لیکوال۔2011۔

پہلی بات تو یہ کہ یہ جدید شاعری ہے۔ دوسری یہ کہ یہ ایک خاتون شاعرہ کی تخلیق ہے۔ جرات اظہار کی ایک زندہ مثال۔ کیونکہ سلمیٰ ایک عام شاعرہ نہیں ہے یہ ہر لحاظ سے ہماری محبت و احترام کے قابل ہے۔ ہمارا فخر ہے یہ ایک دردمند قوم پرست لڑاکی پشتون شاعرہ ہے۔ میرے سامنے سلمیٰ کی دوسری کتاب ہے۔ "تروہ خنسی وزروی"

یہ سلمیٰ کی ایک نظم کا عنوان ہے۔ اس نظم میں اس کے بچپن کی یادیں ہیں مگر اس میں خطابت اور ابلاغ کی جو قوت موجود ہے وہ سب کی ترجمانی کرنے کی قوت رکھتا ہے۔

اس کتاب کا انتساب سلمیٰ نے اپنے والد کے نام کیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ سلمیٰ کے والد ایک غیور پشتون، جنگ ازادی کے سپاہی، اور فرنگی سامراج کے خلاف جنگی سپاہی تھے۔ ایک نہ جھکنے والے خدائی خدمتگار تھے۔ انتساب کے آگے کے صفحے پر ایک شعر ہے۔

ستا د خواہش پہ کوم یو حد پہ کوم مقام کی یمہ۔

ھسی دے خاوری کڑم ایری کڑم جانہ پوئی و ے نہ کڑم"

ترجمہ۔۔ تمہاری خواہش کی کونسے حد اور کس مقام پر ہوں۔ ایسے ہی خاک اور راکھ ہوئی اور پتہ ہی نہ چلا۔"

کتاب کی پہلی نظم "تخیل" ہے۔ سلمیٰ نے ساری ازاد نظمیں لکھی ہیں جو بہت اچھی ہیں اور یہ نظم اس کی شاہکار نظم ہے۔ سلمیٰ اس نظم میں قدرت کی رنگینیوں۔ اور فطرت کی روشنیوں میں ڈوبی ہوئی لگتی ہے مگر یہ حسن اس کے پاس پہلے سے موجود ہے۔

مشہور شاعرہ ادیب رحمت شاہ سائل نے اپنی ایک کتاب "د پشتو شاعرئ آئینہ" میں محترمہ سلمیٰ شاہین کے دوسرے شعری مجموعے "زولہ حسنی وزدوے" پر اپنا ایک مقالہ شامل کیا ہے۔ اس میں وہ محترمہ سلمیٰ کی شاعری کے بارے میں لکھتے ہیں۔

" سلمیٰ اپنے ہم عصر شاعرات میں عمر میں کسی سے بڑی اور کسی سے چھوٹی ہیں۔ جیسے محترمہ سیدہ بشریٰ بیگم۔ زیتون بانو۔ الف جانہ خٹک۔ فوزیہ انجم وغیرہ یا پھر حسینہ گل۔ جمیلہ بلال۔ پیلا ایریدئ وغیرہ مگر ان سب میں سلمیٰ کا ایک الگ اور منفرد مقام ہے اگرچہ خواتین ادبی میدان میں آسانی سے نہیں آئیں انہوں نے بہت قربانیاں دی ہیں۔ سلمیٰ کے لیے بھی یہ آسان نہیں تھا اس نے اپنی ہم عصر شاعرات کی قربانیوں کی روایت کو زندہ رکھا ہے

چی د زڑہ آئینہ

ماتہ د خپل وجود احساس را کڑو۔

"دل کے آئینے نے جب مجھے میرے وجود کا احساس دلایا۔"

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ محبوب کے دل کا آئینہ اسے اس کے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ اور یا پھر یہ اس کے محبوب کے وجود کا احساس تھا جو اسے ہو گیا۔ اس نظم میں تخیل کی جو پیاس ہے احساس محرومی کی جو پوشیدہ تصویر ہے۔ وہ ایک فنی ابہام کا مدہم مدہم دھواں ہے جو آنسوؤں

میں مسکراتا اور مسکراہٹ میں روتا ہے۔

دوسری نظم "تپوس" یعنی، سوال، لگتا ہے اسی مسکراہٹ اور آنسوؤں کی حقیقت پسندانہ تفسیر ہو مگر وہ تپوس میں جو سوال کرنا چاہتی ہے وہ نہیں کر سکتی کیونکہ حیا اور انا دونوں کے وجود کو قائم رکھنے کے لیے ہمارے معاشرے میں روزانہ جوانیاں قربان ہوتی ہیں۔

یہ روشنی اور رنگ جسے وہ ڈھونڈ رہی ہے۔ خود اس حسن کی تشبیہ ہے یا پھر یہی حسن ہے جو اس کے فکر و خیال کو ان روشنیوں اور رنگوں کی طرف لے جاتا ہے۔

"ماوی رانول ئی کڑی

خو چی لگہ ساہ واخلم"

ترجمہ۔۔۔ "میں نے کہا کہ تمہیں بھینچ لوں مگر سانس لینا چاہی تو تم میری بانہوں سے پھسل گئے۔"

جہاں نظم کا اختتام ہوتا ہے قاری کو ایک ابہام سے روشناس کراتی ہے جسے ہم فنی لحاظ سے شعری ابہام کہتے ہیں جو شعر کی خوبصورتی اور خوبی کہلاتی ہے۔۔

یہ روشنی اور رنگ جسے وہ ڈھونڈ رہی ہے۔ خود اس حسن کی تشبیہ ہے یا پھر یہی حسن ہے جو اس کے فکر و خیال کو ان روشنیوں اور رنگوں کی طرف لے جاتا ہے۔

"ماوی رانول ئی کڑی

خو چی لگہ ساہ واخلم"

ترجمہ۔۔۔ "میں نے کہا کہ تمہیں بھینچ لوں مگر سانس لینا چاہی تو تم میری بانہوں سے پھسل گئے۔"

جہاں نظم کا اختتام ہوتا ہے قاری کو ایک ابہام سے روشناس کراتی ہے جسے ہم فنی لحاظ سے شعری ابہام کہتے ہیں جو شعر کی خوبصورتی اور خوبی کہلاتی ہے۔۔

میں بذات خود شاعری میں مرد اور عورت کی تفریق نہیں مانتا مگر ہمارے معاشرے میں جب خاتون تخلیق کار جنم لیتی ہے تو وہ اتنی جرات نہیں کر سکتی کہ وہ جو شاعری کرتی ہے اس کا برملا اظہار بھی کرے۔ اور اگر جرات کر کے وہ کہتی بھی ہے تو پھر معاشرہ اس کے سامنے ہوتا ہے۔ صرف گھر کی پابندیاں نہیں ہوتیں۔ کیونکہ مرد ہمارے معاشرے کا آزاد پنچھی ہے اور خاتون حیا اور اور باوقار قیدی۔

خوشحال خان سے لے کر غنی خان تک سب نے اپنے عشق کا بے باکانہ اظہار کیا

شاعری میں کیا ہے۔ لیکن اگر کوئی خاتون اس کا اظہار کرے جب ہماری نفسیات کو کچھ ہونے لگتا ہے۔ سلمیٰ کی شاعری خاموش شور سے نکلتی ہے۔

"زڑه د ابراهیم کړه که سوک ظلم د نمرود کوی

سوزه خو په غله د سوزیده وخبری مه کوه۔

ترجمہ۔ اگر کوئی نمرود بن کر ظلم کرے تو تم ابراہیم بن کر جیتا جا۔ اور زبان پہ جلن کا نام مت لا۔"

میں ہر پشتون شاعرہ کے ساتھ سلمیٰ کو عظیم مانتا ہوں کیونکہ اگر اس نے روایات کی پاسداری کی ہے تو نئے اور تازہ جذبوں کو پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ سلمیٰ کی اس کتاب کے لیے میں روایتی بول نہیں بولوں گا۔ کہ پشتو ادب کی دولت میں ایک اور خزانے کا اضافہ ہوا ہے۔ مگر میرے خیال میں اس کتاب کا مقام ضرور ہونا چاہیے۔

اور اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق جدت کے دروازے بھی کھولے۔ سیانے کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اس منظر میں اپنی قتل گاہوں کا ادراک بھی کرنا چاہیے کیونکہ یہ روشنیاں مفت میں نہیں ملی۔ "پھول کے حسن کو ہم محسوس تو کر سکتے مگر ضروری یہ ہے کہ پھول کے کھلنے کی تکلیف اور درد کا اندازہ بھی ہم کر سکیں۔ سلمیٰ کو بہت ساری چیزیں وراثت میں ملی۔ پھر نوکری بھی اس ادارے میں کی جہاں مردوں کی اکثریت تھی اس نے بھی بہت کچھ سہا ہو گا۔ مگر اس نے پروانہ کی اپنا ریسرچ اور اس کے ساتھ تخلیقی کام جاری رکھا۔ سلمیٰ نے اگرچہ اپنی تحریروں میں بے باکانہ اظہار کیا ہے مگر اس فن پارے میں اس نے اپنے سر سے دوپٹہ نہیں اترنے دیا۔

یہ مسئلہ جسے سلمیٰ نے منعکس کیا ہے صرف اس کا مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ ہم سب کا مسئلہ ہے۔ سلمیٰ نے نظم "زرنگر" اور "وار" کو ایک فن پارے کی شکل دی ہے۔ "تہ ورته سہ وئیلم" میں تمہیں کیا لکھوں؟ نظم صبح نو کے شمع کی آخری ہچکی ہے۔ دیگر نظمیں بھی بہت اچھی ہیں مگر "خوب" یعنی نیند میں سلمیٰ نے کھل کر اظہار کیا ہے وہ قابل داد ہے۔ اس نظم میں جیسے اس نے زندگی کے ہر لمحے کو قطرہ قطرہ سمیٹا ہو اور ہر لمحے کو ایک معنوی درد عطا کیا ہو۔ اس درد سے ایک تصویر بنائی گئی ہو۔ اور اس تصویر میں کیفیات کی وہ تبدیلیاں پیدا ہوں جس میں کبھی ہنسی ہے اور کبھی رونی ہے۔ اس نظم کے چار حصے ہیں۔

پہلے حصے میں وہ اس خواب کا قصہ بیان کرتی ہے جس میں وہ ایک انسان کو دیکھتی ہے وہ کردار اور گفتار دونوں میں اچھا ہوتا ہے جیسے فرشتہ، وہ پھولوں کا گلدستہ لاکر اسے دیتا ہے۔ دوسرے حصے میں اسے اچانک غصہ آتا ہے اور غصے کا اظہار بھی فنی انداز میں کرتی ہے۔ فنی اس لیے کہ اس نے اپنے غصے کے لیے ان الفاظ کا انتخاب کیا ہے جس سے دل کو سکون بھی ملتا ہے اور فنی صورت بھی رکھتا ہے۔ تیسرے حصے میں یہ اسے جو بھی بولتی ہے اس کی جلی کٹی سننے کے باوجود وہ اس کو مطمئن کرنے کے لیے اپنی وکالت سے مطمئن کرتا ہے اتنا مطمئن کہ اس کے چہرے پہ پشیمانی امڈ آتی ہے اور حیا کے رنگ آجاتے ہیں۔ چوتھے مرحلے میں یہ قہر و غضب کے عالم میں ہوتی ہے۔ اب چاہتی ہے اسے سمیٹ لے مگر جب یہ ہاتھ آگے بڑھاتی ہے اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ اس کو نیند میں ہنسی آجاتی ہے اور خود سے کہتی ہے۔ نادان! کبھی خواب بھی سچے ہوئے ہیں؟ اور سایہ بھی ہاتھ آیا ہے؟ اس نظم میں جو کیفیاتی تبدیلیاں یکے بعد دیگرے آتی ہیں وہ نظم کی خوبصورتی کم کرنے کی بجائے اس کے حسن کو دوبالا کر گئی ہیں۔ کیونکہ اس میں فنی توازن ہے۔ سلمی کی یوم مئی پہ نظم "سوار" اور "زہ درہ سہ وتیم" اور دیگر نظمیں بھی بہت اچھی ہیں میں نے سلمی کی غزل کو اس طرح نہیں دیکھا۔ کیونکہ سیانوں کے مطابق غزل عورت سے باتیں کرنے کا نام ہے۔ ضمیر جعفری کہتے ہیں۔

مولوی اونٹ چلائے ہمیں منظور مگر

مولوی کار چلائے ہمیں منظور نہیں۔

تو اگر خواتین نے غزلیں زیادہ لکھنی شروع کی تو ہم مرد غزل کو از سر نو دیکھنے کی سعی کریں گے پھر شاید اس پر نظر ثانی کی گنجائش نکل آئے۔

پھر بھی میں یہ کہنا چاہوں گا کہ پشتو میں غزل نے خود کو زندہ رکھا ہے اور خواتین نے بھی غزل میں ہر طرح کا اظہار اور نئے نئے تجربے کیے ہیں۔ اور سلمی کی غزل بھی اسی راستے کی مسافر ہے۔ سلمی کی شاعری پر تنقید بھی کی جاسکتی ہے مگر نظم گو خواتین محدود چند ہیں یہ بات بھی نہیں کہ ان میں تنقید برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں ہے۔ مگر ان کو وہ مواقع ضرور کم ملتے ہیں اور ایسے میں ہم خواتین نظم گو کو ان کے حق اظہار اور وسعت فن و خیال کی معنوی وسعت میں اپنے ولا کل وارث کے تخت و شیریں میں شریک نہ کریں کہ ویسے بھی ان کو اظہار خیال کے مواقع نہیں ملتے۔

"د پشتو شاعرئ آئینہ" رحمت شاہ سائل۔ ص۔ "252 - 267

سلمیٰ شاہین پشاور یونیورسٹی کے شعبہ پشتو سے وابستہ ہیں اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ "نوے سحر" منظر عام پر آیا تو قاری چونک اٹھے کہ واقعی نئی سحر کی شاعرہ نئے تجربات نئی صداقتوں اور نئی امیجری لے کر شعر و سخن کی دنیا میں وارد ہوئی ہیں۔ ان کے ہاں صداقت و خلوص نمایاں ہیں۔ وہ ایک نیا پیغام نیا ولولہ لے کر میدان میں وارد ہوئی۔ سلمیٰ شاہین الفاظ کا استعمال چابکدستی سے کرتی ہیں۔ اس کے الفاظ اور محاکات ندرت کے حامل ہیں۔ روہان مسافر کی نظر میں سلمیٰ شاہین ایسے شعر کہہ کر پشتون معاشرے میں ایک بہت بڑے انقلاب کی طرح ڈال رہی ہیں۔ نظموں میں "دریغہ" "اے کاش۔ لفظوں کے چناؤ انکا بر محل استعمال اور بلندی خیال کی وجہ سے اپنی مثال آپ ہیں۔ سلمیٰ شاہین کی ایک انفرادیت یہ ہے کہ وہ آزاد نظم لکھنے والی واحد خاتون ہیں۔ انھوں نے آزاد نظم لکھنے کا حق ادا کیا ہے۔ "نوے سحر" کی ابتداء "غوټۍ" "پھول سے ہوتی ہے۔ اس شاہکار نظم میں بڑی عمدگی سے سلمیٰ نے ایک زبوں حال معاشرے کو نئی صبح کے آنے کا مژدہ سنایا ہے۔۔

" شفیق صابر۔ جدید نظم پہ پشتو کی" ص410

باب دہم

مختلف کتابوں کے لکھے گئے پیش لفظ

سلمیٰ شاہین نے اکیڈمی کے زیر اہتمام اور اکیڈمی سے باہر شائع ہونے والی نظم و نثر کی درج ذیل کتابوں کے پیش لفظ بھی تحریر کیے ہیں۔ سوات کی لوک کہانیاں (اردو)، د خوندو توئے، تذکرۃ الاولیاء، پرواز، د شعور ڈیوئی، انتخاب بچتے لیکوالے، د خاموشئ شور، شپیلو خوبونو۔ تعبیر تلوسہ، ورک د سوال لیدل شہ، د ارمان پہ سیوری، د بینے یو جہان، دردونہ نکوروونہ، جان کیٹس اور غنی خان کی رومانیت کا تقابلی جائزہ، سپین تسبل، تور سری، پشتون کون، پشتون اور پشتو ادب، د ارزانی خوشکی کلیات، گل بیدہ، پشتو اور اردو کے نمائندہ افسانے، بیجڑ شمعے، حمزہ خان شنواری کی زندگی اور کلام، ادب تراش، کلیات رحمان اردو ترجمہ، بازنامہ اردو ترجمہ، دستارنامہ اردو ترجمہ، پختو مثنوی، تنقیدی ادب، باغ و بہار، تور گلاب، زلفندہ صباؤن۔

ادبی تنقید " پروفیسر ڈاکٹر عارف نسیم کی کتاب ہے اس پر محترمہ سلمیٰ شاہین نے "چند الفاظ" میں لکھا ہے۔ پشتو اکیڈمی تنقید کے حوالے سے ایک اہم کتاب کی طباعت کا اعادہ کر رہی ہے ۔یہ کتاب ڈاکٹر عارف نسیم نے لکھی ہے۔ جو سالوں کی محنت پر مبنی ہے۔ ڈاکٹر صاحب ایم اے عربی کی کلاس میں مولانا عبد القادر کے شاگرد بھی رہے ہیں۔ اور ان سے تنقید کے بارے میں اہم نکتے سیکھے ہوئے ہیں۔ انہی کے کہنے پر 1957 میں بنوں کالج میں پشتو اختیاری تدریس کا فرض بھی نبھایا ہے۔ یہ کتاب ادبی تنقید کے بارے میں کئی رخ لیے ہوئے ہے۔ جیسے ادب۔ ادب کی تخلیق۔ ادب کی قسمیں۔ تنقید کی ابتداء اور ارتقاء۔ کلاسیکیت۔ رومانیت۔ حقیقت نگاری۔ شعر کے اقسام۔ نثر کے اقسام بھی بتاتے ہیں۔ اس کے ساتھ تنقید کے حوالے سے اہم موضوعات اٹھائے ہیں۔ بلاغت و عروض کے موضوعات بھی بہت اچھے ہیں۔ یہ کتاب پشتو ادب کے میدان میں بہت سودمند ثابت ہوگی۔ اور استفادے کا باعث بنے گی۔

"ادبی تنقید" ص_2-1 جون 2007۔ اشاعت پرنٹنگ پریس پشاور

پروفیسر سلمیٰ شاہین نے جمیل یوسفزئی کی تالیف "د خوند ټوقې" پر "پیوند گو-یعنی تعارف کے عنوان سے لکھا۔ "د خوند ټوقې" جمیل یوسفزئی کی علاقائی نقلیں ہیں جو دلچسپ رواں اور شیریں ہیں۔ محاورے اور مقامی لوگوں کی طنز و مزاح کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ یہ عام لوگوں کی بناتی ہوتی ہیں جو ہمارے فوکلور کا حصہ ہیں۔ یہ طنز و مزاح عوامی تجربات کا نچوڑ ہے۔ خوند ټوقې ضرب الشال کے وہ نمونے ہیں جو معاشرتی زندگی کا ابھار ابراظہار ہے۔ ان لطائف میں دیہی زندگی کی سادگی بے ساختگی نمایاں ہے۔ انسانی زندگی حادثات و تجربات کی اساس پر تمدنی ارتقاء سے گزرتی ہے۔ زندگی جب متحرک ہوتی ہے تو اس میں ٹھوکریں بھی لگتی ہیں۔ کہتے ہیں تجربہ اچھی درسگاہ ہے۔ جس کی فیس درد میں ہوتی ہے مگر جو اس کو پالے وہ کمال کو پہنچتا ہے۔

دوسروں کا استاد بن کر مثال بن جاتا ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے پہلا آدمی دوسرے کے لیے پل کا کام کرتا ہے انہی کے تجربوں سے دوسرے مستفید ہوتے ہیں۔ پشتونوں کے حجرے اور گھروں میں ایسی مثالیں پڑی ہیں۔ جمیل یوسفزئی کی یہ تالیف اس علاقے کے برجستہ طنز و مزاح کے نمونے ہیں فوکلوری ادب کا حصہ ہے۔ پختونخوا کے ہر حصے میں مقبول رنگ موجود ہیں۔ جسے ہر حصے کے محققین۔ محسسین۔ اور متجسسین اپنے علاقوں سے نقل کرکے محفوظ کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ خزانہ ہمارے سادہ لوح عوام کے فکر و سوچ رکھنے والوں سے جڑا ہوا ہے۔ تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں ایسا نہ ہو زمانے کے سیلاب میں ہر چیز سے محروم ہو جائیں۔ ہم اس وقت بے تحاشا ثقافتی یلغار کی زد میں ہیں۔ اگر اس وقت یہ ثقافتی ورثہ محفوظ نہ ہوا تو ہم اپنا قومی تشخص کھو دیں گے۔ ہم فخر یہ اس دنیا کی تاریخ میں متعارف ہوئے ہیں۔ ہمارا سارا قومی ورثہ بالعموم عوامی ادبیات بالخصوص ہماری ملی اور قومی صفات کی امین اور ترجمان ہے یہ ہمیں ہماری روایات پشتو اور پشتونوں کی یاد دلاتی ہے اس میں ہماری رزم و بزم کا ادب محفوظ ہے۔ یہ ہماری اچھی بری زندگی کی عکاس ہے۔ اور ہمارے سادہ لوح عوامی سوچ و فکر کے فن پارے ہیں۔ جو تہذیب کی باد مخالف سے ابھی گرد آلود نہیں ہوئے تو وہ اپنی قومی تشخص اپنی پشتو کو ہم محفوظ کر دیتے ہیں۔ جمیل یوسفزئی کی یہ تالیف ایک خوش آیند قدم ہے۔ پشتو اکیڈمی نے اس امید پر اس کی اشاعت کا ذمہ لیا ہے کہ اس اقدام سے شاید یہ سود مند ثابت ہو۔

محترمہ شاہین "د خوند ټوقې۔ ص۔ 15-17۔

پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین نے پشتو اکیڈمی کے سابق ڈائریکٹر پروفیسر محمد نواز طائر کی شخصیت اور فن کے حوالے سے ایک طویل مقالہ "د پختو د بڑ طائر" کے عنوان سے لکھا۔ یہ مقالہ پروفیسر نواز طائر کی کتاب "د شعور ڈاگ" میں شائع ہوا۔ اس مقالہ سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔

د پختو په وچو سانگو طائر نوا پیر ادے
چې دوه ران وګلو راشي هر بلبل به شي خطیب۔

پشتو کی سوکھی ٹہنیوں پر طائر نوا پیرا ہے جب ان ٹہنیوں پر پھول آئیں گے تو سارے بلبل بولنا شروع کر دیں گے۔

اور جب میں ان سے پوچھتی "آپ فارغ ہیں" تو جواب دیتے "لوگ فارغ ہو کر موت کا انتظار کرتے ہیں۔ میں ایسا نہیں کرنا چاہتا میں تو کہتا ہوں "اے موت ابھی ٹھہر جا"

اسلامیہ کالج کے دور میں پشتو اردو دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے۔ افسانے اور مضامین لکھتے رہے۔ اس دور کے پشتو اکیڈمی کے ڈائریکٹر مولانا عبدالقادر کو ان کی پوشیدہ صلاحیتوں کا علم تھا اور پھر جب ان کو جہانزیب کالج سوات بطور لیکچرر بلایا گیا تو انھوں نے انکار کیا۔ مولانا نے طائر کو 1958 میں تحقیق و تنقید کے کام کے لیے پشتو اکیڈمی میں لگایا۔ ساتھ ہی ان کی پڑھائی جاری رہی رہی۔ 1963 میں فارسی اور 1964 میں پشتو میں ایم اے کیا۔ 1963 میں آدم خان درخانئ کی رومانی داستان پر مقالہ لکھا جس کو بہترین کتاب کا پہلا انعام اپا سین آرٹس کونسل کی طرف سے ملا۔ اپنے تجربہ کار استاد کے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے ادبی و تحقیقی کام کے ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی۔ مقالے لکھتے اور شائع کرواتے رہے۔ طائر کی شاعری متنوع اور معنی خیز ہے۔ فن مضامین اور عصری تقاضوں کو رنگ اور آہنگ لیے ہوئے ہے۔ یہ زندگی کی حقیقتوں کی ترجمان ہے۔ ان کی روایت پسندی زندہ اور متحرک ہے۔ طائر کا کلام ردیف اور قافیے کی پابند بھی ہے۔ اور "د شعور ڈاگ" کی طرح آزاد شاعری کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔

ص۔16 - 10۔ جدون پریس پشاور شہر۔

محمد نواز طائر ڈاکنڈ ایجنسی کے گاؤں تھانہ میں پیدا ہوئے نسلاً خا تخیل بائیزے یوسفزئی ہیں۔ ان کا گھرانہ اپنے گاؤں کے خان خوانین میں شمار ہوتا ہے۔ بچپن میں ان کی پرورش ایک

غریب عورت دائی اماں نے کی۔ یہ زیادہ تر وقت ان کے گھر گزارتے تھے۔ کھیتوں میں ان کے مویشی چراتے، کھیتی باڑی میں ہاتھ بٹاتے وہ جو محنت مشقت کرتے یہ بھی ان کی مدد کرتے تھے۔ سکول سے واپس آکر سیدھا ان کے گھر جاتے اور خوش ہوتے۔ اسی طرح انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی فطرت کے قریب گزاری اور فکر انگیز اور غم انگیز ماحول سے آشنائی نے ان کی فکری سوچ کو تبدیل کیا۔ وہ کہتے ہیں "اس دور میں لاشعوری طور پر معاشرے میں طبقاتی اونچ نیچ نے ان کے دل میں احتجاج کا جذبہ ابھارا۔ وہ اپنے والدین کی طرح دائی اماں کو پیار کرتے تھے۔ ان کے ماموں عدلیہ کے سول سیشن جج تھے اور بعد میں الیکشن کمشنر صوبہ سرحد بنے۔ انھوں نے طائر صاحب کی کتاب ""تالیدے سوات" کا پیش لفظ لکھا اس میں وہ لکھتے ہیں"

> "گھر میں شعر کہنے کو برا خیال کیا جاتا تھا جب یہ ساتویں جماعت میں تھے تب
> ایک کتاب کے برابر شاعری ان کے پاس تھی والد صاحب کو پتہ چلا تو
> انھوں نے بہت غصہ کیا اور طائر نے طیش میں آکر اس مجموعے کو آگ
> لگادی۔ یہ اس کی معصومیت کی پہلی قربانی تھی۔"

طائر صاحب نے 1951 میٹرک کیا اور آگے پڑھنے کے لیے اسلامیہ کالج میں داخلہ لیا یہاں کا ماحول ادبی لحاظ سے سازگار تھا۔ اس ماحول نے دبی ہوئی چنگاری کو بھڑکایا وہ مجلہ "خیبر" کے ایڈیٹر بنے دو سال پشتو حصے کے نگران رہے۔ سرحد مسلم فیڈریشن سٹوڈنٹس کے سرگرم کارکن رہے کالج کے جیوگرافیکل سوسائٹی کے ممبر اور بزم ادب کے فعال رکن اور پھر سیکرٹری بنے۔ 1955 میں اسلامیہ کالج پشاور سے بی اے پاس کیا لاھور سے جغرافیہ میں ایم اے کی ڈگری لی۔ 1960 میں پشتو آنرز کیا۔

یہ میرے ہمدرد محسن ہیں جو کچھ عرصے سے میری دلچسپی کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ طائر صاحب کبھی کبھی کڑوی کسیلی اور کبھی شیریں نصیحتیں بھی کرتے ہیں۔ شیریں ایسی کہ ذہن اسے قبول کرتا ہے اور نصیحت تو ویسے بھی کڑوی لگتی ہے۔ ان کی شخصیت وصلاحیت پر ان کی نظم نثر، علم و ادب، تحقیق و تخلیق اور کارناموں پر کچھ محترمین نے مقدمے اور مضامین لکھے ہیں جو مختلف جرائد میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں محترم ایوب صابر۔ بریگیڈئر صادق اللہ خان۔ محترم سلیم راز۔ محترم تاج سعید وغیرہ وغیرہ ہر ایک نے ان کو مختلف زاویوں سے دیکھا پرکھا ہے۔ ملک تاج سعید

نے توان کو پشتو ادبیات کا بکھیرو یا پنچھی کہا ہے۔ پشتو اکیڈمی کے ایک کمرے میں دنیا و مافیہا سے الگ پشتو زبان کی ترقی کے لیے سنجیدگی سے کام کرتے رہتے ہیں۔ طائر صاحب تحقیقی و تنقیدی ادبی کام میں مشغول ہیں اور اپنی مادری زبان کو جلا بخش رہے ہیں۔ بچوں کے لیے پشتو گیت۔ عوامی داستانیں۔ پشتو رومانی ادب پر ان کا کام نئے محققین کے لیے بیش بہا خزانہ ہے۔ ان کی پشتو ادبیات کی تاریخ ایک جامع علمی، ادبی اور تحقیقی کاوش ہے۔ نامور بنگالی شاعر رابندر ناتھ ٹیگور کی آفاقی نظم "گیتا نجلی" کا پشتو میں ترجمہ کیا۔ اس نظم پر ٹیگور کو نوبل انعام سے نوازا گیا تھا۔ انہوں نے کئی عالمی ادبی افسانوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ پشتو زبان و ادب۔ تاریخ اور لسانی تقاضوں پر مبنی اس کتاب میں جو بحث ہوئی ہے وہ ہمارے ادب عالیہ کی پیش رفت کے لیے ایک سرمایہ ہے۔ محترمہ سلمی شاہین نے "یو سو خبری" کے عنوان سے مشہور پشتو ادیب، محقق، شاعر پروفیسر محمد نواز طائر کی سوانح حیات "ادب تراش" پر پیش لفظ میں لکھا ہے۔۔۔ "ادب تراش پروفیسر محمد نواز طائر صاحب کی خود نوشت سوانح حیات ہے۔ اپنی زندگی کا قصہ انہوں نے کچھ ایسے انداز میں لکھا ہے کہ سرگزشت بھی ہے، تاریخ و ادب بھی۔ تنقید بھی ہے اور رپورتاژ بھی۔ سفرنامہ بھی ہے اور خود تنقیدی اور خودکلامی بھی۔ ایسے علمی، ادبی، تحقیقی ادب پارے پشتو زبان و ادب میں نہیں ملتے۔ اس طرح کی تخلیق جرات کا تقاضہ کرتی ہے۔ کیونکہ زندگی کا سچ بیان کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ اصل خود نوشت انسان کی زندگی کے سرد و گرم واقعے بہ سے بیان کے ساتھ ساتھ اپنی کمزوریاں بھی بیان کرنا ہوتی ہیں۔ جو لاشعوری طور پر اس کی شخصیت اور نفسیات کا حصہ بن جاتی ہیں۔ یہ خود نوشت ان ستر سالہ زندگی کے تجربوں کا نچوڑ ہے جس میں ہر قسم کے حالات آئے ہیں۔ جسے انہوں نے بہت محتاط انداز میں قلم بند کیا ہے۔ جس وجہ سے یہ خود نوشت اشاعت کا متقاضی ہے۔ وہ ان کی تحریر کی شائستگی اور اور ان کا دل آویز انداز ہے جو تاریخی حقائق کو کہانی کی زبان میں پیش کرتے ہیں۔ خود نوشت زندگی کا آئینہ ہوتا ہے جس سے جھوٹ اور سچ کے پیمانے کا اندازہ قاری کو پڑھنے کے دوران ہو جاتا ہے۔ ادب تراش طائر صاحب کا ایک علمی کارنامہ ہے وہ خود ایک کامیاب محقق، افسانہ نگار، شاعر اور آزاد نظم کے موجد ہیں۔ بہت سے تاریخی پس منظر ادب تراش کے خاص موضوع ہیں۔ جس میں کئی تاریخی حوالے آئے ہیں۔ طائر صاحب نے یوسفزئی قبیلے کو ان کے نامداری سرگزشت سے آگاہ کیا ہے۔ پشتون قوم کے نسب ناموں اور شجرہ

انساب کو یکجا کیا ہے۔ حافظ رحمت خان روہیلی شہید کی اہم تالیف "خلاصۃ انساب فارسی سے پشتو میں ترجمہ کیا اور انساب کے تحفظ کی روایت اور تسلسل کو جو زمانہ قدیم سے جاری تھی اور جس کا ریکارڈ کئی مورخین و تاریخ نگاروں نے اپنے انداز میں رکھا تھا۔ اس روایت کو جدید سائنسی تقاضوں کے مطابق (Gentics) کی ضرورت کے تحت دوبارہ زندہ کیا۔ ظاہر صاحب نے پشتو فوکلوری ادبی تحقیق میں بہت کام کیا ان کے روحی ضرب الامثال پر امریکی محقق لن بارولی آکسفورڈ یونیورسٹی انگلستان نے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ اسی طرح ان کی تحقیق اہم یادوانہ (محترمہ سلمیٰ شاہین نے کئی ایک پیش لفظ بطور ڈائریکٹر پشتو اکیڈمی لکھے۔

"ادب تراش۔ سلمیٰ شاہین۔ ص۔" 4 - 7

عظمت ہما کے ایم فل کی تحقیق پر محترمہ شاہین نے حرف چند لکھا ہے وہ شامل کرنا چاہتی ہوں "حرف چند"

تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ افسانے کی ابتدا اردو اور پشتو دونوں زبانوں میں کم و بیش ایک ہی دور میں ہوئی۔ اس ہم عمری کے باوجود پشتو میں یہ نثری صنف بوجوہ وہ مقام حاصل نہ کر سکی جو اردو افسانے کو نصیب ہوا۔ اس کے باوجود گزشتہ نصف صدی کے دوران پشتو افسانے کا ارتقائی سفر کافی حوصلہ افزا رہا۔ اس وقت پشتو افسانہ دیگر نثری اصناف کے مقابلے میں مقدار اور معیار دونوں لحاظ سے کافی ترقی کر چکا ہے۔ اس سے پشتو ادب میں افسانے کی مقبولیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور یہ بھی پتہ لگتا ہے کہ پشتو کے افسانہ نگاروں نے اس صنف کو مقبول بنانے میں پوری مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ آج کا پشتو افسانہ پوری دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ اس میں زندگی کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ اور زبان و بیان کی خوبیوں کے علاوہ فکر و فن کے معیار پر بھی یہ دنیا کی کسی بھی زبان کے ہم پلہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ افسانے کی مقبولیت کی وجہ سے اس صنف کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق کا کام ہو رہا ہے۔ زیر نظر مقالہ اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ محقق نے اردو پشتو کے نمائندہ افسانوں کو بنیاد بنا کر اس نثری صنف کے مشترکہ خدوخال تلاش کرنے کی سعی کی ہے۔ اس تحقیقی کاوش میں دونوں زبانوں کی منتخب کہانیوں کے تجزیاتی مطالعے کے حوالے سے اشتراک کے بڑے دلچسپ خاکے سامنے آتے ہیں۔ جن میں موضوعاتی اور فنی یکسانیت کے جائزے شامل ہیں۔ ان جائزوں کی پیشکش میں تحقیق کے جدید اصولوں کو پیش نظر رکھا گیا

ہے۔ اور ان سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ اس سے بلاشبہ دونوں زبانوں کے افسانوں میں اظہاراتی موضوعاتی اور فکری رجحانات کی کچھ ایسی جہتوں پر روشنی پڑتی ہے جو پہلی بار ایک مربوط تحقیقی کاوش کی صورت میں یکجا کی گئی ہے۔

"اردو اور پشتو کے نمائندہ افسانے" تقابلی جائزہ۔ ستمبر ۲۰۰۵

محترم ہمیش خلیل نے "دچاربیتہ شاعران" کے نام سے پشتو نثر کے پشتو چاربیتہ لکھنے والوں پر کتاب لکھی جو پشتو اکیڈمی کا پراجیکٹ تھا۔ اس کتاب پر پیش لفظ میں محترمہ ڈاکٹر سلمیٰ شاہین لکھتی ہیں۔ " یہ 1985 کی بات ہے جب میں پشتو اکیڈمی میں بطور جونیئر افسر کام کر رہی تھی۔ ایک فوجی کپتان اکیڈمی آیا اور کہنے لگا" میں ایک پشتو چاربیتہ ڈھونڈ رہا ہوں جو کچھ اس طرح ہے۔

"زڑہ می بند دے د ہجران پہ کنارہ
زخمی دے کڑمہ سپینہ خارہ

وہ کہنے لگا' یہ میں اس لیے ڈھونڈ رہا ہوں کہ ہماری فوجی بینڈ کی طرز اس کی آہنگ پر بنی ہے۔ مجھے اپنی زبان کی اہمیت کا احساس کچھ زیادہ ہونے لگا۔ یہ وہی زمانہ تھا جب چین میں پاکستان کے سفیر عبدالعزیز خان جو مردان سے تعلق رکھتے تھے، نے کسی سے کہا تھا کہ پشتو اکیڈمی جاکر نورادین کی چاربیتہ کی کتاب ڈھونڈ کر اس کی فوٹو کاپی مجھے بھیج دیں۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ اس کتاب کو کسی نے پڑھنے کے لیے لیا تھا۔ میری طبیعت ایسی ہے کہ کتاب کے پیچھے پڑ گئی اور اسے ڈھونڈنے لگی۔ نورادین کی صرف ایک ہی کتاب رہ گئی تھی وہ بھی اکیڈمی کی ملکیت تھی مگر اس وقت اکیڈمی میں نہیں تھی۔ اگر غلطی پر نہ ہوں تو یہ چاربیتہ پروفیسر ڈار مستیئر کی کتاب "باغ و بہار" میں مل گیا تھا۔ بس اس دن سے میری خواہش تھی کہ تمام چاربیتوں کو ڈھونڈ کر یکجا کرکے کتابی شکل میں شائع کرکے محفوظ کیا جائے تاکہ تحقیق کرنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا ہوں اور یہ ادبی ذخیرہ بھی محفوظ ہو۔ اسی طرح پوشیدہ بچی تاریخ بھی منظر عام پر آجائے گی۔ مجھے پکا یقین ہے کہ ہر چیز اللہ کی رضا سے ہوتی ہے مگر اس کے لیے پکا ارادہ بھی چاہیے ہوتا ہے۔ جب میں نے بحیثیت ڈائریکٹر پشتو اکیڈمی اپنی ذمہ داریاں سنبھالی تو اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش شروع کی۔ اس عمل کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایک محنتی اور جفاکش محقق کی ضرورت تھی اور بہتر وسائل بھی درکار تھے۔ بہت سوچنے کے بعد اس کام کے لیے میں نے نہ تھکنے والے باصلاحیت محقق ہمیش خلیل کے حوالے کیا جو اس میدان

میں تجربہ کار تھے اس کی محنت اور اس کے کام سے کوئی انکار نہیں کر سکتا جن کی اپنی زبان کے لیے کام کی پیاس اتنی ہے کہ طوفانوں کی زد میں آنے کے باوجود ان کے قدم ڈگمگاتے نہیں وہ یونہی باحوصلہ اور باہمت رہے۔ وہ اسی محبت اور دیوانگی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ میں نے ہمیش خلیل سے بات کی مجھ سے پہلے گورنر صوبہ سرحد لیفٹیننٹ جنرل افتخار حسین شاہ نے پشتو اکیڈمی کو پشتو زبان و ادب کی ترقی و ترویج کے لیے کچھ فنڈ مختص کیا تھا۔ میں نے سوچا اس فنڈ کا بہترین استعمال اس کے علاوہ کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے ذریعے یہ تاریخی ذخیرہ اپنی نئی نسل کے لیے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔ چاربیتہ اپنی صنف کے لحاظ سے کئی اقسام رکھتا ہے۔ اور موسیقیت کی چست بندوں کا بے مثال فن ہے۔ ہماری تاریخ ثقافت۔ شاعری۔ رہن سہن۔ کی لازوال مثالیں دوسری زبانوں میں ملنا ناممکن ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم وسائل کے نہ ہونے سے یہ خزانے کھو بیٹھے اس کا محفوظ کرنا بہت ضروری ہے۔ پشتون اپنی زبان۔ قوم۔ تاریخ اور ثقافت سے محبت کرتے ہیں۔ وہ اس امید اور آس پر کبھی کام نہیں کرتے کہ اس کے بدلے انہیں کچھ ملے گا۔ ہمیش خلیل کی محنت میں کوئی شک نہیں۔ اور مجھے خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ میرے ہاتھوں یہ کام مستقبل میں محققین کے لیے اور طالب علموں کے لیے استفادے کا سبب بنے گی۔ اگر یہ خدمت کسی کے کام آئے تو امید ہے کہ وہ مجھے اپنی دعاؤں میں ضرور یاد رکھیں گے۔

"پروفیسر ڈاکٹر سلمی شاہین ڈائریکٹر پشتو اکیڈمی پشاور۔"

پشتو اکیڈمی مجلہ "پشتو2005" میں محترمہ سلمی شاہین کا ایک مقالہ 'ارباب ہدایت اللہ خان پشتو آزاد نظم کا پیش رو" کے عنوان سے لکھتی ہیں۔ "جدید نظم کی جدید شعراء میں جدید تجربوں کی ابتدائی کوششوں میں سید رسول رسا۔ فضل حق شیدا۔ اور اشرف مفتون کے بعد جس شاعر کا نام آتا ہے وہ ایڈورڈز کالج پشاور کے اس وقت کی "بلوشہ" کے طالب علم ایڈیٹر ارباب ہدایت اللہ خان ہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق انہوں نے 1962 میں مجلہ "تجلی" پشتو حصہ کے لیے پہلی آزاد نظم "سپوگمئی" یعنی چاند کو لکھی تھی۔ اس نظم کے بعد ان کی نظم "ستوری" یعنی "ستارے" کو لکھی گئی۔ پشتو شعری ادب میں یہ آزاد نظم کا پہلا تجربہ مانا جاتا ہے۔ ارباب ہدایت اللہ خان نے جدید نظم کی تاریخ میں آزاد نظم لکھنے والوں میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اس سے پہلے معریٰ نظم کو بے قافیہ نظم یا غیر مقفیٰ نظم کہا جاتا تھا۔ یعنی لوگ ابھی آزاد نظم یا معریٰ نظم کی الگ پہچان سے نا آشنا تھے۔ اس بارے میں

عبد الکافی ادیب لکھتے ہیں۔ "آج سے چالیس سال پہلے بے قافیہ نظموں پر تجربے ہوئے اور بقول اجمل خٹک پشتو زبان کی ادبی تاریخ میں ارباب ہدایت اللہ پہلے شاعر تھے جس نے پشتو ادب کو معری نظم سے متعارف کروایا۔ اس نے اس صنف میں قابل ذکر تنوع اور رنگینی پیدا کی۔ آزاد نظم فنی و ادبی مقام رکھتا ہے یا نہیں رکھتا مگر ارباب ہدایت اللہ آزاد نظم میں تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ جس سے انکار ممکن نہیں کیونکہ اس سے پہلے کسی نے اس انداز و ہیئت کے تجربے کے حوالے سے کام نہیں کیا۔ انہوں نے سرکاری درسی کتب کے لیے کئی نظمیں لکھیں جو اس دور کے پشتو درسی کتب میں شامل کی گئیں۔ دوسری جماعت کے درسی کتاب کے ہے "موئگ مسلمانان یو" ہم مسلمان ہیں کے عنوان سے بھی نظم لکھی۔ کئی نظمیں اس دور میں ریڈیو پاکستان سے نشر ہوئی ہیں۔

• سلمی شاہین۔ پشتو مجلہ۔ جنوری۔ فروری۔ مارچ۔ 2005۔"

باب گیارہ

پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین بطور اداریہ نگار

سال ۲۰۰۳ء میں پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین نے پشتو اکیڈمی کا چارج بطور ڈائریکٹر سنبھالا۔ وہ اس عہدے پر پہلی خاتون ڈائریکٹر تھیں۔ پشتو اکیڈمی سے سہ ماہی مجلہ "پشتو" شائع ہوتا ہے۔ ۲۰۰۳ میں محترمہ سلمیٰ نے بطور چیف ایڈیٹر اداریے لکھنا شروع کیے ان اداریوں کچھ قابل ذکر نمونے یہاں شامل کر رہی ہوں۔

عزیز پڑھنے والو!

مجلہ "پشتو" کے چار نئے شمارے سائز اور Getup میں شائع ہونا ایک نیا تجربہ تھا۔ یہ تجربے آپ کے خطوط اور مشوروں کی روشنی میں یوں لگتا ہے کامیاب ہو گئے۔ آپ نے ہمیں حوصلہ دیا اور یہ فیصلہ بھی کیا کہ پشتو کو اب سہ ماہی کیا جائے۔ جس بے صبری آپ نے دکھائی اور جس طرح ان شماروں کا آپ انتظار کرتے ہیں۔ محبت سے لیتے اور پڑھتے ہیں اور پھر ہمیں اپنی آراء سے مطلع کرتے ہیں۔ تو ایسا لگتا ہے کہ ان مجلوں میں ادبی، تنقیدی، تحقیقی، تخلیقی مضامین اور مقالے آپ کے معیار پر پورا اترے ہیں۔ تھوڑی بہت کی و بیشی یا پروف کی غلطیاں جو آپ نے نشاندہی کی ہے آئندہ نہ کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم اس پر خوش ہیں کہ آپ نے ہماری محنت کو سراہا۔ اس کام میں ہمارے سینئر ادیبوں نے ہماری مدد کی۔ ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ خصوصی طور پر محترم پروفیسر محمد نواز طائر صاحب۔ محترم قمر راہی صاحب۔ محترم ہمیش خلیل صاحب۔ ڈاکٹر چراغ حسین صاحب۔ پروفیسر حامون بابا صاحب۔ پروفیسر عارف تسیم صاحب۔ ڈاکٹر خالد خان خٹک۔ پروفیسر حدایت اللہ۔ محترم آصف صمیم۔ م۔ ر۔ شفق۔ محترم رحیم شاہ رحیم۔ اور کئی دیگر اہل ادب جنھوں نے ہماری اس کاوش کو سراہا۔ اور اپنے اچھے مشوروں سے خطوط کے ذریعے

نوازا ہے اور تجاویز دی ہیں۔ ہم آگے بھی آپ کے خطوط اور تجاویز کے منتظر رہیں گے۔ پشتو آپ ہی کی تحریروں سے اراستہ ہوگی۔ ہم اپنی کوشش کریں گے کہ مجلہ وقت پر آپ تک پہنچے پشتو زندہ قوم کی زبان ہے جو ہزاروں سال پرانی تہذیب، تمدن اور تاریخ رکھتی ہے تاریخ تمدن تہذیب دن مہینے اور سالوں میں نہیں بنتے۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ نئے زمانے اور حالات میں اب پشتون بحیثیت پشتون قوم اپنی زبان کی تضحیک نہیں کرتے اور نہ ہی ہمارے دانشور، محقق، اور مورخ بعض تاریخی حقائق سے چشم پوشی کریں گے۔ دنیا کی نظریں ہماری جانب ہیں۔

غیر پشتون، پشتو زبان کا لکھنا پڑھنا سیکھ رہے ہیں۔ پھر پشتون کیوں اس زبان سے پیچھے ہو۔ جیسے بھی ہو پشتونوں کو اب اپنے اصل کی جانب لوٹنا ہوگا۔ اور اب پشتونوں کو احساس بھی ہو گیا ہے۔ پشتو اور پشتونوں کے لیے ان کا فکر مند ہونا ان کے روشن مستقبل کا سبب بن سکتا ہے۔ حالات جیسے بھی ہوں پشتو کی ترویج میں اب ہمیں اچھا موقع ہاتھ لگا ہے۔ لوگ پشتو اس لیے سیکھ رہے ہیں کہ وہ پشتونوں کی اجتماعی اور معاشرتی نفسیات سے واقفیت حاصل کریں۔ ہم پشتو کی ترویج اس لیے کر رہے ہیں کہ پشتون اپنے اصل کردار اور معنی میں دنیا کے سامنے عیاں ہو۔ یہ خطہ جس میں پشتون زندگی گزار رہے ہیں۔ اپنی ایک تاریخی اہمیت اور حیثیت کا حامل ہے۔ اس حقیقت کی طرف علامہ اقبال نے کئی سال پہلے اشارہ کیا تھا۔ اور اس کو ایشیا کا دل کہا تھا۔ اور یہ بھی یہی ہے جب دل سکون میں ہو تو پورے جسم کو ارام ملتا ہے۔ مگر آج اس خطے کی جہالت، پسماندگی، غربت اور بے سکونی دنیا کے لیے ٹھیک نہیں اور خود پشتون بھی بڑی آزمائش میں مبتلا ہیں۔۔ اس کے جو بھی نتائج ہوں گے مگر عالمی نشریاتی اداروں میں پشتو نے اپنا ایک مقام اور جگہ بنائی ہے۔ اور دنیا بھر میں پھیلے ہوئے پشتونوں کے دلوں میں پشتو کی محبت روز افزوں بڑھ رہی ہے۔ اب پشتو زبان قومی اور بین الاقوامی سطح پر فروغ پا رہی ہے۔

ہم اس بات پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہیں کہ پنجاب یونیورسٹی میں پشتو ڈپلومہ، سرٹیفیکیٹ شروع ہوئے۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام اباد اور قاید اعظم یونیورسٹی اسلام اباد میں بھی پشتو بحیثیت مضمون پڑھائی جاتی ہے۔ اگر چہ یہ نصاب پشتو، اردو، اور انگریزی تمام زبانوں میں ہے مگر مقصد پشتو اور پشتون کے بارے میں تاریخ اور ثقافت مجلو کے ماہانہ اور سالانہ نمبر زشائع ہوتے ہیں۔ ہم پشتو زبان کے تقریباً ساڑھے سات سو تنظیمیں رکھتے ہیں جو پشتو زبان کی ترقی وترویج

کی کوششوں میں دن رات مصروف ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ پشتو اکیڈمی کے قیام کی غرض و غایت مکمل ہونے کو ہے کیونکہ اپنے قیام کے پچاس سالوں میں مختلف عالموں نے جو تحقیقی کام کیا ہے یا پشتو کی ادبی تاریخ مرتب کی ہے وہی مختلف درسی نصابوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ اسی طرح پشتو اکیڈمی اپنی زبان، تاریخ اور ثقافت کی ترویج میں فعال کردار ادا کر رہی ہے۔ ہم ان کاموں کی تکمیل میں پشاور یونیورسٹی اور پاکستان اکادمی ادبیات کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کیونکہ اکیڈمی اف لیٹرز ہی کی وجہ سے ہماری کاوشیں تکمیل پاتی ہیں۔ 3 اگست کو پشاور میں اکادمی ادبیات پاکستان کی طرف سے منعقدہ تقریب میں خوشحال خان خٹک "حیات و فن" کے کتاب کی رونمائی بدست گورنر صوبہ سرحد کمانڈر خلیل الرحمان ہوئی۔ یہ مقالہ محترمہ ڈاکٹر خدیجہ فیروزالدین نے انگریزی زبان میں۔

life and work of the illustrious khushal khan khattak .... chieftain of khattaks

..... لکھا تھا اور پشتو زبان کے پروفیسر ڈاکٹر اقبال نسیم خٹک نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔ اس تقریب میں محترم گورنر نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر یہ مقالہ انگریزی زبان میں شائع ہو جائے تو خوشحال خان خٹک کے فن سے پوری دنیا کو واقفیت حاصل ہو جائے گی۔ ہم پشاور یونیورسٹی کے ٹریژرر ڈاکٹر حافظ ثناءاللہ کے مالی مدد کے بھی شکر گزار ہیں۔

سہ ماہی "پشتو" جولائی۔ اگست۔ ستمبر۔"

محترمہ سلمیٰ شاہین ۱۲ ۲۰۰۵ اکتوبر کے اداریے میں لکھتی ہیں۔

عزیز قاری! اکتوبر۔ نومبر و دسمبر ۲۰۰۵ کا سہ ماہی مجلہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ چار موسموں بہار، خزاں، گرما اور سرما کی موسمیاتی ترتیب سے اس کو شائع کریں۔ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ آپ کی ذہنی طمانیت کے لیے کچھ تخلیقی ادب غزل، نظم افسانہ اور دیگر اصناف بھی شامل کریں۔ اور عالمی ادب کے شاہکار تخلیقات کا ترجمہ بھی آپ تک پہنچائیں۔ اس سلسلے میں ہم معیاری تحریریں دلچسپ تاریخی واقعات کے منتظر رہیں گے۔ ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ کو ہمارے ملک میں قیامت خیز زلزلہ آیا جس میں بہت جانی اور مالی نقصان ہوا۔ اس حادثے میں لوگ زندہ درگور ہوئے بہت سے معذور ہوئے اپنے اپنوں سے بچھڑ گئے۔ اس آزمائش میں تلخ حقائق سامنے آئے۔ بہت سے لوگوں نے انسانیت کی خدمت کی۔ جان و مال کی ایسی تباہی کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ایسے ناگہانی آفات، سانحات، حادثات اور المیے قوموں کی زندگی میں آتے رہتے ہیں

مگر ایسے اوقات میں ایک مضبوط قوم کی حیثیت میں بھی اور ایک پکے مسلمانی عقیدے اور جذبے سے بھی صبر حوصلہ اور استقامت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ انسان کی زندگی کا اختتام موت ہے۔ زندگی میں اپنے حصے کا کام کرنا ہے ایسے حقائق کی طرف صوفیا، اولیا اور بزرگان دین نے اپنے اقوال میں اشارے کیے ہیں زلزلے کے بارے میں اخبارات اور ٹیلی وژن سے اچھے لوگوں کی خبریں بھی ملیں جو اندرون اور بیرون ملک سے مدد کو پہنچے۔ مگر کچھ ملکی اور مقامی لوگوں کی لوٹ مار نے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ یہ بھی ایک سوال ہے کہ معاشرے اس قدر غیر مہذب اور اخلاق باختہ ہو جائیں جو دوسرے انسانوں کی تکالیف، درد اور غم میں بھی غرض اور مطلب نکالتے ہیں۔ ایک طرف کی یہ تباہی اور دوسری طرف محلات میں نرم بستروں میں زندگی گزارنے والوں کو کوئی فکر نہیں۔ زندگی رہٹ کا ڈولچہ ہے ڈولتا رہتا ہے یہ حادثے، تکالیف، محلات ڈھا بھی سکتے ہیں۔ ایسے وقت میں تماشہ دیکھنا اپنی ذمہ داری سے پہلو تہی کرنا۔ مدد خود نمائی کے لیے کرنا۔ مسلمانی نہیں۔ ہم بے خبر کیوں ہیں، ؟ ادارہ ہزاروں لوگوں کی شہادت پر ان کے پسماندگان کے ساتھ ان کے دکھ میں شریک ہے۔ ہم پشاور یونیورسٹی جیالوجی ڈیپارٹمنٹ کے مرحوم پروفیسر ڈاکٹر حمید اللہ کی زلزلہ زدگان کی مدد کرتے ہوئے ان کی شہادت پر غمزدہ ہیں ہم پشاور یونیورسٹی کے ایک دوسرے قابل محقق دانشور پروفیسر ڈاکٹر ممتاز بنگش کے انتقال پر بھی غمزدہ ہیں اللہ ہمیں ایسی آزمائشوں سے اپنے امان میں رکھے آمین اور مرحومین کو جنت میں اعلیٰ مقام دے۔

"پشتو۔ اکتوبر۔ نومبر۔ دسمبر۔ ۲۰۰۵ء۔

سلمیٰ شاہین جنوری، فروری اور مارچ 2006 کے شمارے میں بطور اداریہ لکھتی ہیں۔

"جنوری، فروری مارچ کا شمارہ منتخب تحریروں کی وجہ سے یقیناً آپ کو پسند آئے گا۔ ہماری کوشش ہے کہ آپ کے لیے ایسے تحقیقی اور تنقیدی مضامین لائے جائیں جس میں بھرپور معلومات ہوں۔ اور پڑھنے والوں کو اس سے فائدہ ملے۔ یہ اچھی بات ہے کہ ہمارے ملک میں تحقیقی کلچر فروغ پا رہا ہے۔ یہ وقت کا تقاضہ بھی ہے کہ ہر چیز پر عبور حاصل کرنے کے لیے حقائق کو سامنے لایا جائے۔ اب دنیا بدل گئی ہے۔ جتنا وقت آگے جا رہا ہے سوچ اور فکر کے انداز بھی بدل رہے ہیں۔ نئے علوم و فنون۔ حقائق اور تجربات انسانوں کی ذہنوں کو وسعت بخش رہے ہیں۔ اب حوالوں اور

دلائل کے بغیر نہ کوئی بات سنتا ہے اور نہ ہی پڑھنے میں وقت ضائع کرتا ہے۔ ہم اپنے محترم ادیبوں سے درخواست کرتے ہیں کہ جو لکھے مدلل لکھے۔ اور خوب محنت کریں کیونکہ اب ہم پشاور یونیورسٹی اور ہائیر ایجوکیشن (HEC) کمیشن کے حکم کے مطابق یہی تحقیقی انداز اپنائیں گے۔ تاکہ پڑھنے والے بھی اس کے عادی ہو جائیں۔ پشتو اکیڈیمی پشاور یونیورسٹی کا پہلا تحقیقی ادارہ ہے اور ہم اس پر فخر کرتے ہیں۔ کہ ابھی تک اس ادارے نے اپنی ذمہ داری بطریقہ احسن نبھائی ہے ہم امید کرتے ہیں کہ محقق، ادیب اور دانشور اپنی محنت سے لکھنے کے معیار کو قومی اور بین الاقوامی تحقیقی معیار کے برابر لائیں گے۔ سال 2006 جنوری کے مہینے میں پشاور یونیورسٹی میں دو بنیادی انتظامی تبدیلیاں ہوئیں۔ پرانے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ریٹائرڈ ممتاز گل صاحب نے بحیثیت یونیورسٹی وائس چانسلر کے ذمہ داریاں پوری کیں۔ اب یہی ذمہ داریاں محقق اور ایماندار پروفیسر پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید صاحب پوری کر رہے ہیں۔ ہم ان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ فروری کے پہلے ہفتے میں دوست ملک چین سے شاعروں اور ادیبوں کا ایک وفد پاکستان آیا۔ یہ پشتو اکیڈیمی کے مہمان تھے۔ انھوں نے پشتو اکیڈیمی کی لائبریری بھی دیکھی۔ اور پشتو ادبی قلمی نسخوں اور کتب میں بھرپور دلچسپی لی۔ سال رواں میں 26 فروری کو خدائی خدمتگار تحریک کے بانی خان عبد الغفار خان کے بیٹے خان عبد الولی خان کی رحلت ہوئی۔ خان عبد الولی خان نے سیاست کے علاوہ پشتو ادب اور ثقافت کی ترقی و ترویج کے لیے اپنا وقت وقف کیا تھا۔ اس حوالے سے ان کے انتقال سے ایک بڑا خلاء پیدا ہوا ہے۔ پشتو ادارہ غمزدہ پشتونوں کے ساتھ اس غم میں برابر کا شریک ہے۔ اور ان کی مغفرت کے لیے دعا گو ہے۔

"پشتو جنوری، فروری، مارچ۔" 2006

پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین مجلہ "پشتو" جنوری فروری مارچ 2005 کے اداریے میں لکھتی ہیں۔

"ہم معذرت خواہ ہیں اور ہمیں احساس ہے کہ پشتو اپنے وقت پر آپ تک نہ پہنچ سکا۔ اگرچہ ہماری کوشش یہی ہوتی ہے کہ قارئین کو زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔ مگر پھر بھی اچھی اور معیاری تحریروں کے انتظار میں دیر سویر ہو جاتی ہے۔ ہمارا اصل مقصد پشتو زبان، فکر، فلسفہ، تاریخ، ثقافت اور نئے علوم و فنون کے ساتھ اپنے آنے والی نسلوں کو منتقل کرنا۔ محفوظ کرنا اور اشاعت

کرتا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ نئی نسل تحریر اور تحقیق کے ہنر سے آگاہ ہو۔ اور بڑے فنکاروں اور شاعروں، ادیبوں محققین کی منتخب تحریریں بھی اس غرض سے شائع کرتے ہیں۔ اچھی تحریریں، تحقیق بلاشبہ اچھا علم، اچھا مطالعہ دلیل اور محنت مانگتی ہے۔ اس میں ہور بہت وقت لگتا ہے۔ لیکن ہونا بھی یہی چاہیے کہ یہ ادبی، علمی، تحقیقی پیاس بجھائے اور پڑھنے اور لکھنے والوں کو بھی مطمئن کر سکے۔

26 مارچ 2005 کی ادبی جمن کی جانب سے نشتر ہال میں ایک ادبی کنونشن کا انعقاد ہوا یہ سہ روزہ کنونشن جس میں ہمارے صوبہ کے وزیر اعلیٰ محترم اکرم خان درانی جو خود بھی ایک قابل اور شخصیت ہیں نے اپنی مادری زبان کے ساتھ وفا اور محبت کا اظہار کیا۔ انھوں نے پشتو کو بطور لازمی مضمون آٹھویں جماعت تک سرکاری نصاب میں شامل کرنے کا اعلان کیا ہم ان کے اس اعلان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

14 اپریل کو پشتو ادبی تنظیم "ہمیش ملگری" نے بڑے محقق شاعر، ادیب اور نقاد ہمیش خلیل کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کی پچھترویں پلاٹینیم جوبلی سالگرہ ایک سیمینار میں منائی۔ یہ بہت اچھا عمل ہے کہ اپنے محترمین کو ان کی زندگی میں خراج تحسین پیش کیا جائے۔ جنھوں نے اپنی پوری زندگی زبان و ادب کی خدمت کر کے گزاری ہو۔ ہم آپ کو یہ اطلاع بھی دے رہے ہیں کہ پشتو اکیڈمی کی نئی مطبوعات "نور سری" "تیتین تمبل" "غنی خان اور جان کیٹس کی شاعری کا تقابلی جائزہ۔ پشاور یونیورسٹی اور ادبیات پاکستان اسلام آباد کی مالی مدد سے شائع ہوئی ہیں جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

"پشتو۔ جنوری۔ فروری۔ مارچ۔" 2005

محترمہ سلمیٰ شاہین جولائی، اگست، ستمبر 2004 مجلہ پشتو کے شمارے میں لکھتی ہیں۔

"پشتو کا یہ شمارہ بہت سے حوالوں سے آپ کو نیا لگے گا۔ ہم چاہتے ہیں کہ "پشتو" موجودہ ادبی اور تحقیقی معیار کے مطابق ہو۔ ہم نے پشتو کی تحریروں کا معیار بلند کرنے، ضخامت بڑھانے اور سائز بڑھانے کی کوشش کی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کو کمپیوٹرائزڈ بھی کیا ہے۔ تاکہ پڑھنے والوں کی علمی ذوق میں اضافے کے ساتھ ساتھ ان کی بصری، جمالیاتی تسکین کی گنجائش پیدا ہو۔ ہم اس سلسلے میں آپ کی قیمتی آراء اور تجاویز کے بھی منتظر رہیں گے۔ ہم چاہتے ہیں پشتو کا یہ مجلہ پشتو زبان و

ادب، فوکلور، ثقافت فنون، تاریخ، آثار، پشتو اور پشتونولی کے بارے میں ہر قسم کی تحقیقی مقالوں، تنقیدی اور تخلیقی فن پاروں اور دیگر زبانوں سے تراجم کی معیاری تحریروں سے آراستہ ہو۔ پشتو مجلہ کا ادارہ پشتو زبان کے پہلے چینل اے وی ٹی خیبر کو بھی خوش آمدید کہتا ہے۔ امید ہے اس چینل کے ذریعے پشتونوں کی پوشیدہ صلاحیتوں کو جلا ملے گی۔ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے پشتون ثقافت کی صحیح ترجمانی ہو گی۔ ادارہ محترم ادیب داور خان داود کو صدارتی ایوارڈ ملنے اور ساتھ ہی محترم شاعرہ ادیب قمر راہی اور محترم صحافی رحیم اللہ یوسفزئی کو تمغہ امتیاز ملنے پر مبارکباد دیتا ہے۔ ہم محترم ادیب ایاز داوودزئی صاحب کو ان کی کتاب "ادبی حسن" کو اکادمی ادبیات کی طرف سے ایوارڈ ملنے پر مبارکباد دیتے ہیں۔

ہم اردو زبان و ادب کے نامور ادیب، ڈرامہ نگار، افسانہ نگار و کالم نگار اشفاق احمد کے انتقال پر غمزدہ ہیں اور ان کے لواحقین کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔

"سہ ماہی پشتو۔ جولائی اگست۔ ستمبر۔2004۔"

محترمہ سلمی شاہین نے مجلہ "پشتو" کو باقاعدگی سے جاری رکھا ہر بار اس مجلے کا معیار پہلے سے اچھا رہا۔ سال2006 جولائی، اگست، ستمبر کے شمارے سے ایک اقتباس پیش کرتی ہوں۔

"اس بار کوشش کے باوجود بھی سہ ماہی "پشتو" وقت پر شائع نہ ہو سکا جس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ جیسا کہ آپ کو علم ہے پشاور یونیورسٹی نے پشتو اکیڈمی کو ایم فل اور پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ اب یہاں پشتو زبان، پشتون ثقافت اور تاریخ قبیلوں، زمین و جغرافیہ اور دیگر میدانوں میں پشتونوں کو ڈگریاں مل سکیں گی۔ اس سلسلے میں پراسس مکمل کرنا تھا جیسے کورس ورک، سیمیسٹر، ٹائم ٹیبل، داخلے اور دیگر باقی کام جو طالب علموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے سارے ریسرچ سکالرز، پبلیکیشن آفیسرز اور پشتو ادارے کے دیگر ممبرز اس میں مصروف تھے۔ اب ہم نے کلاسز کا اجراء کر دیا ہے۔ ساتھ ساتھ تحقیق اور اشاعت کا کام بھی جاری ہے۔ 7 اکتوبر کو صوبائی گورنر لیفٹیننٹ جنرل علی محمد جان اورکزئی نے پراجیکٹ کی بنیاد رکھی۔ جسے HEC نے منظور کیا تھا۔

اس میں پشتون کلچرل میوزیم، آرٹ گیلری، سیمینار، لائبریری اور اکیڈمک بلاک بنائے جائیں گے۔ آنے والے سال کی جنوری میں اس پر کام شروع ہو جائے گا جو مستقبل میں پاکستان

اور ایشیا میں چھپے گا۔ اس بلڈنگ میں پشتون ہیروز کی یادیں اور یادگار ان کے تاریخی کارناموں کے ساتھ ساتھ پشتون ثقافت، بود وباش، اور اس سے متعلق ساری تاریخ ساز شخصیتوں کی آوازیں، تصاویر، جو پشتون کلچر اور تاریخ کی عکاسی کریں گے، رکھے جائیں گے اور یہ سب پشتونوں کی تاریخ اور اپنی زبان میں ہوگی۔ اللہ کرے ہمارا یہ خواب شرمندہ تعبیر ہو۔ 15 دسمبر کو پشتو اکیڈمی نے ایک سیمینار کا انعقاد کیا جس کا موضوع تھا "پشتونوں کی صوفیانہ شاعری اور معاشرتی اصلاح" اس سیمینار میں پشاور یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر ہارون الرشید مہمان خصوصی تھے۔ اسلامک اور ینگل سٹڈیز کے ڈین پروفیسر ڈاکٹر قبلہ ایاز نے صدارت کی۔ مقررین میں ڈاکٹر یار محمد مغموم اور ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک تھے۔ دونوں نے بہت اچھے مقالے پڑھے۔ قبلہ ایاز صاحب نے فرمایا کہ اس مادہ پرستی، بے حسی اور خود غرضی کے دور میں مخلص لوگوں کی بات پر عمل کرنا چاہیے۔ تصوف کی طرف رجوع کرنا چاہیے کیونکہ روحانی، معاشرتی و اخلاقی تربیت بہت ضروری ہے۔ پروفیسر ہارون الرشید نے تحقیقی، ادبی اور علمی میدان میں پشتو اکیڈمی کی کاوشوں پر روشنی ڈالی اس دوران تین روزہ کتابی نمائش کا اہتمام بھی کیا تھا جسے کثیر تعداد میں لوگوں نے رونق بخشی ادارہ ان سب کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

"پشتو" جولائی۔ اگست۔ ستمبر۔ 2006

محترمہ سلمیٰ شاہین سال 2014 میں ریٹائر ہوئیں سال 2013 میں مجلہ "پشتو" کا اداریہ نائب مدیر جناب ڈاکٹر نور محمد دانش بیٹنی نے لکھا۔ اس اداریے کو یہاں شامل کرنا ضروری سمجھتی ہوں کیونکہ سال 2009 میں جب پشاور یونیورسٹی نے پشتو اکیڈمی کو اس وقت یونیورسٹی میں ضم کیا جب ڈاکٹر سلمیٰ شاہین سٹنگ ڈائریکٹر تھیں۔ انھوں نے دو سال تک عدالت میں دھکے کھا کر اور لڑ کر پشتو اکیڈمی کو اس کا وقار اور مقام واپس دلوایا تب محترمہ ریٹائرمنٹ کے قریب تھیں جب پشتو اکیڈمی بحال ہوئی یہ مقالہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے۔

سال 2009 میں پشاور یونیورسٹی کے ایک حکم پر پشتو اکیڈمی کو یونیورسٹی کا حصہ بنا دیا گیا۔ جس کو محترمہ سلمیٰ شاہین نے کورٹ میں چیلنج کر دیا سال 2012 میں عدالت کا فیصلہ محترمہ سلمیٰ شاہین کے حق میں آیا اور انھوں نے دوبارہ بطور ڈائریکٹر پشتو اکیڈمی کام شروع کیا۔ اس سال کا اداریہ محترم نور محمد دانش بیٹنی نے لکھی۔ وہ لکھتے ہیں۔

مجلہ "پشتو" اس کرائسس کے بعد سال 2013 جنوری تا جون شائع ہوا۔ مثل ہے کہ "سوار گرتا ہے" دنیا کی مثال دوسرے جہان میں جانے کے لیے پڑاؤ کی مثال ہے جو پیدا ہوئے ہیں اجل ان کے ساتھ ہے۔ مگر جن کا اس دنیا میں جو وقت مقرر ہے۔ انسان جتنا اس پڑاؤ میں زندگی گزارے وہ مصروف و مشغول ہو کر گزارے۔ وہ کام کرے جو دوسروں کے کام آئے۔ جو مقرر ہے اس کا وقت نہیں معلوم۔ چاہیے کہ انسان اپنی زندگی میں اپنی استعداد، صلاحیت، قابلیت کو ایمانداری سے بروئے کار لائے محنت کرے۔ اور اپنی منزل تک پہنچے اسی طرح زندگی مصروف گزرتی ہے۔ اور یہی روح کی تسلی، سکون اور تسکین کا باعث بنتی ہے۔ بعد میں انسان اپنی زندگی سے مطمئن ہوتا ہے۔ ہم نے یہ کوٹیشن کہیں پڑھا ہے۔ کہ "اگر ایک آدمی بیس سالوں میں خوبصورت نہ ہو۔ تیس میں مضبوط نہ ہو۔ چالیس میں ہوشیار نہ ہو۔ اور پچاس میں مالدار نہ ہو وہ بے مقصد زندگی گزارتا ہے۔ مطلب یہ کہ زندگی کے ہر حصے میں اپنے حصے کی ذمہ داری پوری کرنی چاہیے۔ خود کو اور انسانیت کو خیر پہنچائے۔ اپنی شخصیت اور کردار سے دنیا کو متاثر کرے اور دنیا کے لیے مثال بنے۔ اور اس کے بعد دنیا کھلے دل عزت و احترام کے ساتھ اسے الوداع کہے۔ جو مقام اسے تفویض کیا گیا ہو۔ بات طویل نہیں کریں گے۔ پشتو اکیڈمی میں مختلف اوقات میں اپنی استعداد کے مطابق سکالرز۔ ڈائریکٹرز ادیبوں نے اپنی استعدادی صلاحیتوں، تجربوں اور وسائل کے ذریعے اپنی خدمات دی ہیں۔ مولانا عبدالقادر۔ میاں سید رسول رسا۔ سید تقویم شاہ خیال بخاری۔ عبدالعلی خان۔ غوث محمد خٹک۔ پروفیسر پریشان خٹک۔ پروفیسر محمد نواز طائر۔ پروفیسر ڈاکٹر راج ولی شاہ خٹک۔ ڈاکٹر یدایت اللہ نعیم۔ پروفیسر ڈاکٹر سلمی شاہین جو اب بھی پشتو اکیڈمی کی ڈائریکٹر ہیں۔ ان تمام پروفیسرز۔ ڈاکٹرز اور ڈائریکٹرز کی خدمات کا اعتراف ضروری ہے۔ انہی کی بدولت یہ علمی تاریخی ادبی ثقافتی ادارہ اب تک قائم ہے۔ اچھی اور مضبوط بنیادیں رکھتا ہے۔ پشتو اکیڈمی کے ذکر کے ساتھ مرحوم مولانا عبدالقادر کی خدمات کا اعتراف ضروری ہے۔ جنھوں نے پشتو اکیڈمی کی بنیاد رکھی اسی کی بنیاد سے پشتو ڈیپارٹمنٹ وجود میں آیا۔ پشتو زبان کے ادیبوں، شاعروں، عالموں نے تحریروں کی اشاعت کے لیے راہیں ہموار کیں۔ ان کے بعد آنے والے ڈائریکٹروں نے بھی دن رات اس علمی ادارے میں اپنی فکر اور سوچ و صلاحیت کے مطابق خدمات سرانجام دیں۔

پشتو اکیڈمی 1955 میں وجود میں آئی یہ یونیورسٹی کا پہلا تحقیقی ادارہ ہے۔ یہاں کام کے مختلف شعبے ہیں جیسے فوکلور۔ کلاسیکل لٹریچر۔ ٹرانسلیشن۔ ڈکشنری۔ پبلیکیشن۔ انسائکلوپیڈیا وغیرہ۔ پشتو اکیڈمی کی ایک بہت بڑی لائبریری ہے جو تحقیق کے حوالے سے بڑا ذخیرہ رکھتی ہے۔ جس میں جونیئر سکالرز نے تحقیق کا بڑا کام کیا ہے۔ جو کتابوں میں محفوظ ہے۔ پاکستان میں جتنے بھی ادبی ثقافتی علمی اور تحقیقی ادارے ہیں۔ وہ اسی طرح اپنی تاریخ ثقافت ادبی سیاسی نفسیات پر فخر کرتے اور تحقیق کرتے ہیں۔ جس میں قابل ذکر انسٹیٹیوٹ آف سندھیالوجی سندھ یونیورسٹی جامشورو۔ بلوچستان پشتو اکیڈمی۔ انسٹیٹیوٹ آف پنجاب لینگویج اینڈ کلچر میوزیم۔ انفارمیشن اور علم کے بڑے ذریعے ہیں۔ میوزیم درسگاہ بھی ہے اور سیکھ بھی۔ اس طرح 2006 میں موجودہ ڈائریکٹر سلمی شاہین کی ذاتی خواہش اور کوششوں سے پشتو اکیڈمی میں ایک کلچرل میوزیم کا قیام عمل میں آیا ان کی تجویز سے اس وقت کے وائس چانسلر ریٹائرڈ لیفٹننٹ جنرل ممتاز گل نے اتفاق کیا۔ پیر سید مسرت شاہ۔ قیصر خان۔ علی محمد خان اور کرزئی نے ایچ ای سی کے فنڈ سے اس پراجیکٹ کو مکمل کیا۔ اس سال ہائیر ایجوکیشن کے کہنے پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کی کلاسز شروع ہوئیں۔ اسی طرح یہ ادارہ اور بھی تقویت پا گیا۔ اب باقاعدگی سے پی ایچ ڈی سکالرز تحقیق کرتے ہیں۔ اور ان کے تحقیقی مقالے اکیڈمی کی پبلیکیشن کے تحت مجلہ پشتو میں شائع ہوتے ہیں۔ اس طرح محققین کی سینکڑوں نادر قلمی نسخے محفوظ ہو چکے ہیں۔۔۔ سال 2008 میں پاکستان کے ثقافتی ادارے لوک ورثہ کے اشتراک سے پشتو اکیڈمی نے چالیس پراجیکٹ مکمل کیے جس میں پشتونوں کے بود و باش رسم و رواج کے بارے میں ریسرچ سکالرز محقق اور سٹوڈنٹس اور تجربہ کار اساتذہ نے کام مکمل کر لیے ہیں۔ یہ تحقیقی پراجیکٹس پشتو اکیڈمی نے چھاپے ہیں۔ ادارہ دعا گو ہے اور مستقبل میں تحقیق۔ ادب زبان کے حوالے سے بہت امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔

"نائب مدیر ڈاکٹر نور محمد دانش بیٹنی سال 2013 جنوری تا جون"

باب بارہ

سلمیٰ شاہین کی تخلیقات سے اقتباسات

سلمیٰ شاہین کی نظم و نثر میں جوش، جذبہ، عزم ، انقلاب اور مزاحمت نمایاں ہیں۔ ان کے افسانے "گلونہ" (پھول) کا یہ حصہ ملاحظہ ہو:

> "میں تیزی سے اپنے اندھیرے کمرے میں آئی۔ آنسو صاف کیے۔ قلم اور کاغذ ڈھونڈ رہی تھی۔ میری امی میرے پیچھے پیچھے میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ جانتی تھیں کہ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں لکھنے سے اپنا رشتہ توڑ دیتی ہوں۔۔ اگرچہ کتابیں پڑھتی ہوں لیکن لکھتی نہیں ہوں۔ امی نے پوچھا کیا کر رہی ہو؟ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا امی یہ جو کچھ ہوا ہے اسے لکھ رہی ہوں۔ نہ تو یہ افسانہ ہے اور نہ ہی میں کسی ازم سے متاثر ہوں۔ اور نہ ہی اس مقصد سے لکھتی ہوں کہ میں لکھاریوں کے کسی خاص گروہ میں جگہ بناؤں۔ میرا یہ احساس جو مجھے مارے جا رہا ہے کسی سے متاثر ہونے کا نتیجہ نہیں ہے۔ میرے اندر انسان ازم کا رشتہ ہے جو مجھے جینے نہیں دے رہا۔ اس سب کے ساتھ میں کیسے کمپرومائز کروں۔ میں اس سب پر تنقید کرنا کیسے چھوڑ دوں۔ میں اس سب سے انجان نہیں رہ سکتی۔"

سلمیٰ شاہین کا ناول "کہ رنڑا شوہ" (اگر روشنی ہوئی) بھی مقصدیت سے بھرپور ناول ہے۔ خاص طور پر عورتوں کے حقوق اور جدوجہد کے حوالے سے اس ناول کے کردار اور واقعات پُر اثر ہیں۔ ناول سے ایک نمونہ ملاحظہ ہو:

> "عائشہ کی بیماری آخری حد پر تھی۔ روشنی رویا کرتی تھی۔ ایک دن ہلکی ہلکی بارش برس رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ عباس خان عائشہ کے قریب بیٹھا تھا۔ عائشہ آہستہ آہستہ اس کے ساتھ عائشہ کی باتیں کر رہی تھی۔ اس

نے عباس کا ہاتھ روشنی کے سر پر رکھ دیا۔ کچھ کہہ رہی تھی لیکن عباس سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ روشنی رو رہی تھی۔ اس نے عباس کی طرف دیکھا اور پھر عائشہ کے اوپر جھک گئی اور کہا: اماں میری فکر نہ کرو۔ میں حقیقت کی دنیا میں رہ رہی ہوں۔ اوہام اور آسروں کے پیچھے نہیں بھاگتی۔ تو نے تو بہت کچھ جھیل لیا لیکن میں یہ سب نہیں جھیل سکتی۔ عورتوں کے حقوق کے تحفظ کی بات کر سکتی ہوں۔ میں آپ جیسی نہیں ہوں۔ عباس نے نظریں جھکا لیں۔ عائشہ مطمئن تھی لیکن اس کا ہاتھ عباس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس کی روح پرواز کر گئی۔ عباس خان نے آج اپنے آپ کو بہت اکیلا محسوس کیا۔ اس کی محبت، وفا اور خلوص کا رونا رو دیا۔ روشنی نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی۔ اس نے خوب مقابلہ کیا۔ اپنی سوچ اور اپنی مرضی سے زندگی کی ابتدا کی۔ اس کی آزادی کا یہ قدم عائشہ کی سختیوں سے بھری زندگی کا نعم البدل تھا۔ اس نے اپنی روشنی خود پیدا کی۔ ان اندھیروں کو اس نے روشنیوں میں بدل دیا جنہوں نے اس کی ماں کی زندگی کو ہڑپ کر لیا تھا۔ روشنی اپنا حق چھین سکتی تھی۔ کیونکہ وہ گھپ اندھیری رات اب ڈھل چکی تھی۔ روشن صبح کی ابتدا ہو رہی تھی۔"

باب تیرا ہ

سلمیٰ شاہین کی شعری تخلیقات

سلمیٰ شاہین کی شاعری میں غزل کم او نظم زیادہ ہے۔ انہوں نے نظموں میں اپنے داخلی احساسات و جذبات کا اظہار بھی جرات اور بے باکی کے ساتھ کیا ہے اور معاشرے پر طنز اور تنقید بھی خوب کی ہے۔ ذیل میں ان کی چند نظموں کے تراجم پیش ہیں:

روشنی

تُو کہاں چلا جاتا ہے
روشنی اپنے ساتھ لے جاتا ہے
تُو کتنا اچھا ہے
روشنیاں تیرے ساتھ ہیں
تُو کہیں نہ جا
کہ پھر اندھیرا چھا جاتا ہے
روشنیاں تیرے ساتھ ہوتی ہیں
کتنے اچھے ہیں وہ لوگ
جو تیرے ساتھ رہتے ہیں
وہ جگہ کتنی اچھی ہوگی
جہاں تُو رہتا ہے
تُو کتنا اچھا ہے
روشنیاں تیرے ساتھ ہیں
دعائیں تیرے ساتھ ہیں

اے حسیں نازنیں

اے حسین نازنیں لڑکی!
تیرے رنگ دلفریب ہیں
تُو حسن ہے تُو محبت ہے
عقل و خرد ہو
امن کی داعی ہو
مگر یہ جانوروں بھرا جنگل
یہ گیدڑ اور بھیڑیے
محبت سے انکاری اور اندھے ہیں
حسن کو پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں
عقل کو بھسم کر دیتے ہیں
امن کو تہہ و بالا کر دیتے ہیں
مصلحت بھری تیری یہ کائنات
تیری امیدیں اور نازک آرزوئیں
تیرا ہنر، تیری سخنوری

اے خوبصورت لعل!
ان کے لیے اپنی جان قربان بھی کر دو
یا تم بھی ہو جو؟
پھر بھی تجھے ہرن کی طرح اس جنگل میں خوف زدہ ہی رہنا ہے

بھوک

ابھی تک

تیری زلف

تیرے خال

تیری سیاہ آنکھوں اور ناز و ادا کے

سبھی شیدائی ہیں

ہر ایک کی آنکھ کا تارا ہو

کیا بھنورا

کیا پتنگے

یہ جو جل رہے ہیں یہ جو بھسم ہو رہے ہیں

یہ محض بھوک ہی ہے جو ان سب کو نچا رہی ہے

تم اپنی مرضی کی مالک نہیں ہو

میں اپنی مرضی کی مالک نہیں ہوں

کوئی بھی اپنی مرضی کا مالک نہیں ہے

مجھے کسی کی بھوک مٹانی ہے

کسی کی پیاس بجھانی ہے

یہی ہمارے دور کا المیہ ہے

اور کچھ بھی نہیں ہے

بے بسی اور مفلسی ہے

****

عورت

اے نازک و گل اندام بنتِ حوا
تخلیق کائنات کی ذمہ داری میں شریک ہو کر

تُو نے کس قدر مشکل کام کے نبھانے کا بیڑہ اٹھایا ہے
ہاں تیری خوشی اسی میں ہے کہ تُو ماں بن جائے

تیرے پیروں تلے جو جنت ہے
تُو نے کس کے واسطے اتنے پیار سے سنبھال رکھی ہے

اُس کے لیے کو یہ بھی نہیں جانتا
کہ عورت اس کی ماں ہے، بہن ہے، بیٹی ہے

عورت اس کائنات کا نور ہے
مگر اے میری قوم کی پھولوں جیسی خوبصورت بیٹیو!

تمہارے نصیبوں میں کچھ اور بھی لکھا ہے
کہ نہ صرف تم گوبر سے اوپلے تھاپنے کے لیے ہو

آگے پیچھے نظر دوڑاؤ تو
یہ آدم کے بیٹے بڑے جابر ہیں

کبھی یہ باپ بن کر تمہارے حق میں اپنی مجبوریوں کا رونا روتے ہیں
کبھی بھائی کا روپ دھار لیتے ہیں

اور تمہارا لین دین کرتے اور تمہیں بیچتے ہیں
یہ جو سجی ہوئی محفلوں میں چکر پھیریاں کھاتی ناچتی ہیں ناں

یہ تمہاری ہی بہن ہے ہاں تمہاری ہی بہن
تم یہ بھی بھلا بیٹھے ہو کہ ماں

ہاں ماں نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر تجھ کو پالا پوسا
اگر جسم ڈھانپنے کے لیے لباس نہ ہوتا تو یہی ماں وہ مہیا کر لیتی

خود بھوک کی اذیت برداشت کر لیتی اور تیرا پیٹ بھرتی
تیری فکر میں گھلتی دوسروں کے کپڑے سیتا، خدمت کرنا

کسی امیر کے ہاں کپڑے برتن دھونا
یہ تیری زندگی تھی اے ماں

ساری صعوبتیں برداشت کرتی اور بیٹے کو آرام پہنچاتی
باپ اپنی کسی مجبوری کا بہانہ کر کے تمہیں بالکل اکیلا چھوڑ گیا

وہ کسی اور کے پہلو میں مزے لوٹنے لگتا
تم تو اس کے لیے ایک کھلونا تھی اور ہو

مگر اے عظیم ماں تو کسی کی بھی ماں ہو کسی کی بھی بہن ہو
عزت و تکریم اور حیا و حرمت کا نمونہ ہو

ہزار پردوں میں چھپی اے عورت
یہ جو تیری عزت و ناموس کے درپے ہیں

کیا اس ساری حقیقت کے باوصف
انہیں پھر بھی غیرت نہیں آئے گی

شرمندہ نہیں ہوں گے کبھی

نظم "منزل"

روشنی کی اک چنگاری ہوتی

تو میرے دل کی دھڑکن ہوتی

اک آرزو اک مسکراہٹ ہوتی

تو میری منزل ہوتی

تو میرا ہمراہی ہوتا

میں ترے لیے سرگرداں ہوں

تو مجھ سے دور چلا گیا

یہ گلیاں کیسی گلیاں ہیں

یہ روشنیاں کتنی دور ہیں

تیرے ہو گھپ اندھیرا ہے

یہ ریت بھرا صحرا

یہ دھوپ کتنی گرم ہے

میں ننگے پاؤں پیاسی پیاسی

روشنی کے انتظار میں ہوں

تُو مجھ سے دور چلا گیا

میں سوچتی اور روتی ہوں

کہ تُو چور تھا اور میرا ہمراہی تھا

یا تُو میری منزل تھی۔

....

نظم "دعا"

مرے خیالوں کا وہ مرکز مرے افکار کا وہ پیکر

کہ یہ خوابوں کی تعبیر ہے

تخیل کی رنگینی اور بہاروں کی رنگینی

میں آنکھ۔ آنکھ۔ آنکھ ہوتی اور

کاش میں اسے دیکھتی رہتی

تو بہار کا اک پھول ہوتا

خزاں کی ہوائیں نہ ہوتیں

تو پھول جیسا کھلتا اور کھلتا رہتا

تو محفل کی شمع ہوتی

اس لیے آسماں پر ستارا بن کر چمکتا

وقت کی صبح نہ ہوتی

وہ پرندہ ہوتا

جس کو میں تکتی رہتی

صیاد کے دام نہ ہوتے

تو اڑتا رہتا اڑتا رہتا

اور میری محبت مسکراتی رہتی

****

نظم "گاؤں"

تنگ گلیاں چھوٹے گھر

مرے والد کے گاؤں میں

کبھی کبھی میری نظروں کو

عقاب کی آنکھیں دے دیتے ہیں

میں ہوا میں

آسماں کی وسعتیں ماپ لیتی ہوں

پہاڑوں کو دیکھتی ہوں

وقتوں کا غبار دیکھتی ہوں

بھرے پیالے

ساقی اور جام

خوشی اور سکھ

میں انگشت بدنداں ہوں

ماضی کے روش پر

ہر اک دن قیامت جیسا ہے

سارا جہاں قیامت جیسا

ظلم کے پنڈ

اپنے ہاتھوں سے بناتی ہوں

دل لہو سے

محنت اور مشقت سے

یہ رنگ اور یہ پھول

دنیا سے بھگا لے جاتی ہوں

جمع کرتی ہوں

بکھیرتی ہوں

اور نچھاور کرتی ہوں

اس تپتو دھل گاؤں میں

****

نظم "موسم"

میں نے سوچا تُو پل بھر کے لیے آئے گا
دل گرفتہ ہوں اور تنہائی ہے
ہم دونوں کہیں چلے جائیں گے
تُو نے کہا نہیں جاناں
سیر کرنے کا اپنا موسم ہوتا ہے
تمہارا کیا خیال ہے کہ بہار کا موسم ہو
سرخ و سفید پھول کھلے ہوں
ریڈی اور خشخش کے پھول جھوم رہے ہوں
باغ میں بلبل جیسی حسین لڑکیوں کے
عجب نظارے ہوں
میں آ جاؤں گا لیکن زندگی کا کچھ لطف نہ ہو گا
نہ راببیل اور نہ چنبیلی کے پھول کھلے ہیں
نہ نرگس کے پھول ہیں
خوبروؤں کی قطار میں

جب وہ چاک اندام نہ ہو
جستجو بھی مسکراتی رہے
یہ موسم بھی برا نہیں ہے
لیکن اے محبوبہ
انتظار کر محبوبہ
میں نے کہا رات مگر تُو آ جا
کہیں باہر کھانا کھانے چلے جائیں
مصنوعی فضا ہو گی مگر
سر دو نغمے تو ہو گے
میں تیرے لیے مسکراؤں
تُو میرے لیے مسکرائے
تُو آ جا کہ مجھے راحت ملے
تُو نے کہا نہیں محبوبہ صبر کر
خزاں کا بھی ایک لطف ہوتا ہے
خشک پتے چمن اور راستوں میں
جیسے لگے پڑے کھنڈر بنے دل
پھر ایسے موسم میں اے میری محبوبہ
ہم دونوں خزاں کی ضد میں بھی خوش ہوں

کو دیدار کا کتنا مزہ آئے گا

میں نے کہا ٹھیک ہے مگر خزاں کب آئے گی

میں سفید شفاف آنسوؤں سے تجھے خوش آمدید

کہوں گی

اے جاناں مجھ سے مزید صبر نہیں ہو سکتا

تُو نے کہا تھا اے جان آ جاؤں گا

لیکن ہر چیز کا اپنا موسم ہوتا ہے

تجھے یاد ہے کہ ہجر میں دل پریشاں ہوتا ہے

وصال کے رنج موسم میں

دن ٹھنڈے اور لمبے ہوتے ہیں

سیاہ دھواں شام کے وقت

سارے گاؤں سے لپٹ جاتا ہے

کیا افسردہ سی عصر ہوتی ہے

اور خفا خفا شام ہوتی ہے وصال کا مزہ اور تشنہ دوبالا

ہو جاتا ہے

میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں

کانوں پر ہاتھ رکھ لیا

جیسے تم مجھ سے کہتے ہو

کہ محبت کا اپنا موسم ہوتا ہے

جیسے یہ موسم گزر چکا ہے

لیکن میں کہتی ہوں اے جاناں

کتنے خزاں گزر گئے

کتنی بہاریں گزر گئیں

مدتوں کے تھکے ہارے اور پیاسے

نہ تیرا ارماں پورا ہو سکا

اور نہ میرا ارماں پورا ہوا ہے

****

نظم "عقیدت"

میرا مطلب یہ تھا کہ رسوا ہو جائے
وہ محبت جو تُو مجھ سے رکھتا ہے۔
تُو اس محبت سے انکار نہ کر
مگر میں جو کچھ سمجھ رہی تھی تُو وہ نہ تھا۔
تُو نے محبت سے انکار کر ڈالا
تُو نے حالات کی ساری مجبوریاں بیان کر دیں۔
اس نے کہا بس کرو اے نادان ہم دنیا کی نظروں میں آ گئے۔
میں نے کہا کیوں؟ یہ کیا کہہ رہے ہو۔؟
کیا مجھ میں خودی نہیں یا خود پر تجھے اعتبار نہیں۔
تُو ابھی خام ہے اور تیرا خیال بھی خام ہے۔
جن لوگوں کی محبت نفسانی ہوتی ہے۔
فنا ہو جاتی ہے۔
لیکن یہ محبت ایسی نہیں ہے۔
یہ دنیا پر فریب ہے
کبھی مجھ کو اور کبھی تجھ کو
دلوں کے خطرے دکھاتی رہتی ہے۔
ایسے راستے دکھاتی رہتی ہے کہ

ایک دو کو رسوا چھوڑ کر کے چھوڑ دے۔
تجھے یاد ہے کیا کہ تُو نے کہا تھا کہ
"سونا پاک ہوتا ہے"۔
تُو آگ سے نہیں ڈرتا
ہم نے اپنے لیے منزل کا تعین کر لیا ہے۔
ایک مقصد کو سامنے رکھا ہے۔ لوگ جو کہیں کہنے دو۔
کتنے اسی طرح بھونکتے ہیں اور کارواں گزر جاتے ہیں۔
میں اس رستے پر تنہا منزل تک پہنچ سکتی ہوں۔
لیکن تیرا راستہ دیکھتی رہوں گی جب تک۔
تُو پشتون ہے فقط اتنا کہہ دے
کہ یہ محبت وہ نہیں تھی جو ساری دنیا کرتی ہے۔
یہ تو ایسی عقیدت تھی جو دلوں کو پاکیزہ بناتی ہے۔
انسان کی انسانیت تھی
کسی کو معراج تک پہنچا دیتی تھی اور یہ دل جو میلے کچیلے ہیں۔
منافق اور جھوٹے ہیں۔
یہ چاہتے ہیں کہ یہ محبت رسوائی کا باعث بن جائیں ہم دونوں کے لیے۔
لیکن وہی محبت کرنے والے گیتوں اور مرثیوں میں یاد رہتے ہیں۔
جو سچی محبت میں رسوا ہو جائیں۔
کبھی ہیر اور کبھی رانجھا ہو جائیں۔
یا مجنوں اور لیلیٰ ہو جائیں۔
آدم خان اور درخانئ ہو جائیں۔

موسیٰ خان اور گل مکی ہو جائیں۔

فتح خان اور رابیا ہو جائیں۔

یوسف خان اور شیر بانو ہو جائیں۔

یہ محبت شاہی خانوں کی داستاں بن جائے۔

تورد لے اور ظریف خان ہو جائیں۔

اب کہو کہ چکد روی مائی اچھی ہے جس نے ظریف خان کو بدنام کیا، آگ میں جھونک دیا۔

غداری کے نام پر پیار ہوا؟

ابھی تک اس پر پتھر برس رہے ہیں۔

اس کی قبر بڑی ہوتی جاتی ہے۔

مزید بے عزت اور بے وقار ہوتا جارہا ہے۔

چاہے اس پر پتھروں کا انبار بڑھتا چلا جائے۔

پتھر باندھنے سے کوئی بڑا "معزز" نہیں ہو جاتا۔

اب کہو کہ ہماری محبت کی رسوائی کس کے حق میں بہتر ہو گی؟

تیری یا کسی اور ایسے شخص کے حق میں جو محبت سے بے خبر ہے۔

جسے اس کی خبر ہی نہیں ہے کہ محبت کی رسوائی میں محبت کرنے والوں کا اعزاز ہے۔

***

غزلیات

سلمیٰ شاہین کی غزلیات میں بھی سماج کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ ان میں غزلوں میں رومانی افکار سے زیادہ مقصد سماجی طنز اور تنقید ہے۔ ذیل میں ان کی غزلوں کے نمونے ملاحظہ ہوں:

(۱)

اگر تیرے حسن کے آئینے نہیں بدلے
تو میری محبت کے افسانے بھی نہیں بدلے
پھر اپنی آنکھوں کے کٹہرے میں لے کر میرا دل لے کر قتل کر رہا ہے
ابھی اس کے ظلم کے طریقے نہیں بدلے
گھونسلوں کے اوپر آ کر چمکتی اور گرتی ہے
بجلیوں کے انداز نہیں بدلے
تیرا دستِ ظلم آزاد ہے اور تُو جبر و ستم کرتا جا
میرے شکستہ حوصلے بھی نہیں بدلے
تُو زمانے کی روشنی یاد کر کے مجھے نہ جلایا کر
ہمارے گاؤں کی۔ یادداشتیں نہیں بدلی ہیں
یہ لوگوں کی مرضی کہ مجھ پر پتھر برسائیں یا کانٹے
میرے بھی مضبوط پشتون ارادے بدلے نہیں ہیں
میری شاہین نظریں بھی عقابی آنکھوں کی طلب گار ہیں
ابھی میری طلب اور تقاضے بدلے نہیں ہیں

****

(۲)

راستے سے پلٹنے کی باتیں نہ کر
منزل آجائے گی رک جانے کی باتیں نہ کر
سوچ وبچار نہ کر اور اپنے مقصد کی کشتی آگے کر
دریا میں اتر جا اور موجوں کی باتیں نہ کر
کوئی نمرود جیسا ظلم ڈھائے تو اپنے دل کو ابراہیم جیسا بنا
جلتا جا لیکن جلنے کی باتیں نہ کر
راہ منزل میں آنے والی ہر مشکل کو لات مار
آگے ہی بڑھتا جا اور وسوسوں کی باتیں نہ کر
پھول کی طرح محبت دو تو مسکرا کر دو
ہمیشہ ہجر کے کانٹوں کی باتیں نہ کر
کوئی بات نہیں اگر تیرا وجود احساس کے دام میں گھر گیا ہے
روح کے شاہین سے زنجیر پا کی باتیں نہ کر
میں دنیا سے خوف کھاؤں میری محبت ایسی نہیں ہے
یا کسی کی پرواہ کروں میری محبت ایسی نہیں ہے
خدا وہ وقت نہ لائے کہ میرا سر جھک جائے
میں بار بار کسی کے آگے جھکوں میری محبت ایسی نہیں ہے
یہ خوشامد کا زمانہ سہی اور کوئی خفا ہو کہ خوش رہے

میں ہمیشہ اپنی مرضی کرتی ہوں میری محبت ایسی نہیں ہے
ملاقاتیں ہوتی رہیں گی اب میں برملا کہتی ہوں
کب تک چھپ چھپ کر محبت کروں گی میری محبت ایسی نہیں ہے
سیاہ راتوں میں اور سورج کی شعاعوں میں
میں اس کا دیدار فضا کراوں گی میری محبت ایسی نہیں ہے
اگر پروانہ جل بجھن جاتا ہے تو شمع بھی رو رو کر بجھ جاتی ہے
اگر تو جل رہا ہے تو میں رو رہی ہوں میری محبت ایسی نہیں ہے
کوئی بات نہیں ساقی گر تیرے میکدے سے خشک ہونٹ واپس گیا
میں صہبا کی امید رکھوں گا میری محبت ایسی نہیں ہے
غموں کے یہ لشکر کب تک میرے ارد گرد براجماں رہیں گے
میں شاہین بدحواس ہو جاؤں گی میری محبت ایسی نہیں ہے

****

غزل

خیر کوئی بات نہیں اگر محبوب وقت کے ساتھ بدل رہا ہے
ہر کوئی ساری عمر زمانے میں اپنی کوشش جاری رکھتا ہے

میں کیوں رقیب کی خوشامد یا اس کی منت سماجت کروں
جب تو ہی نے وقت کے ساتھ اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں

خدا میرے مقام کا مجھے علم نہیں کہ تو کہاں ہے
تیری ثنا ہی بہتر ہے اور میں ثنا کر رہی ہوں

ایک لفظ تیری ساری زندگی کو برباد کر دے گا
اس نے کہا میں وفادار ہوں اور زمانے کے ساتھ وفا کر رہا ہوں

میں نے غفلت میں ساقی کا احسان نہ مانا
میں نے زندگی کی محبت زمانے کے ساتھ نبھائی

اے خدا بتا دے ان لوگوں کا کیا بنا
جو عیسیٰ کی طرح زمانے کا ساتھ نہیں دیتے

کسی کے لیے غموں بھری یہ دنیا ایک مزاق ہے
کوئی زخمی دل کے ساتھ زمانے کے سامنے مسکرا رہا ہے

منزل سامنے تھی مگر میں کیوں جانے کے قابل نہ تھی
اے شاہین میں نے زمانے میں اتنی سستی کی

****

غزل

اے دل اس دنیا میں فضول روزگار کو چھوڑ دے
محبت کی اس دنیا میں کاروبار کرنا چھوڑ دے

جاؤ محبت کے ساتھ اللہ کی عبادت کرو
کبر کو زوال ہے، اس رستے پہ جانا چھوڑ دے

اپنی خودداری اک نظر میں ہار بیٹھا ہے
وقار کو اپنا لے اور فضول دلیلیں چھوڑ دے

میں ہمیشہ بے بس مظلوموں کی بہبود چاہوں گی
ممکن ہے تو بھی محبت میں ایسا اقرار کر لے

اے شاہین تو بھولی ہے کہ بتوں پہ دھوکہ کھاتی ہے
میری بھول محبوبہ کہہ کر دلدار تجھے دھوکہ دیتا ہے

****

غزل

میں نے صحرا کے ویرانے میں بزرگوں کی شان کے آثار دیکھے ہیں

تو نے سبھی عاشقوں کو سر کر دیا ہے اے ساقی میں صبر کے ٹھکانے میں بیٹھی ہوں

اے خدا تیری ثنا اور صفت کر رہی ہوں

شب و روز تیرے نغموں میں مشغول ہوں

میں جب اغیار کی محفل میں شریک ہوئی

تیرے فسانے میں بہت سرور تھا

دیکھو سب ہی رقیب غم سے بھاگ رہے ہیں

میں غم کے ساتھ دوستی کی عادی ہو گئی ہوں

خدا سے پختہ ایمان اور اچھے اعمال کی طلب کر۔

اے شاہین اس دنیا کے غم خانہ میں کیا رکھا ہے۔

****

غزل

سارا جہاں بدلا ہوا تھا اور وہ بھی بدلا سا تھا
کوئی نا آشنا تھا جو مجھے آشنا اور اپنا لگ رہا تھا

وہ کوچے کے بیچ رک سا گیا
میں نے کہا آؤ مگر اس نے آنا معطل کر دیا

اس نے کہا محبت اور میں نے کہا تیری کوئی حاجت ہو گی
صاف بات پر اس کے اوسان خطا ہو گئے وہ چور رہیا تھا

میں بھی محبت کی تلاش میں تھی وہ بھی محبت کا طلبگار تھا
مگر میری خودی میرے لیے سرفرازی تھی یا منزل جیسی تھی

میں نے کہا محبت کا قصہ یہاں ختم ہی بہتر ہے
جب حالات کی زنجیریں موت جیسی تھیں

****

غزل

محبت میں مست ہو کر میں نے محبت کا جہاں دیکھ لیا
محبت کو سمجھ بیٹھی محبت کا جہاں دیکھ لیا

اے شیخ تو صحت مند دلوں کی بات کرتا ہے۔ تجھے خبر ہی نہیں
تو صحت مند ہے تو دیوانہ ہو جائے گر جاناں کو مسکراتا دیکھ لیا

پھر محراب و منبر کی ساری باتیں تجھ سے چھوٹ جائیں گی
تو نے خلوص سے انساں کا جھکا ہوا سر اگر دیکھ لیا

اس بار غلطی کر بیٹھی آئندہ محبت سے میری توبہ
ہجر کا غم دیکھ لیا تو مجھے حقیقت کا ادراک ہو گیا

اے اللہ تو آسماں سے پانی برساتا ہے
میں نے زخمی دلوں سے سرخ خون کی بارش کو دیکھ لیا

اے گمراہی کی روشنی تو نے مجھ سے میرا رستہ بھلا دیا
تیرا فریب معلوم ہو گیا میں نے وہ کارواں دیکھ لیا

فرشتوں کے لیے غم بھری یہ دنیا ہی اچھا جواب ہے
وہ ملامت ہوں گے جب انساں کی برداشت کو دیکھ لی

اے شاہین اتنی تکلیف بیڑیاں پہننے کی بھی نہ ہو گی
میری روح گنہگار تھی زندگی کے زنداں کو دیکھ لیا۔

■ ■ ■ ■

غزل

میں کسی کی وفا کے انتظار میں نہیں ہوں
آنسو بہا رہی ہوں اور کسی کے انتظار میں نہیں ہوں

غم کی لہریں مجھے بہالے گئیں پیچھے ہی پیچھے جا رہی ہوں
تیرگی میں خوش ہوں اور روشنی کے انتظار میں نہیں ہوں

میرا دل کیوں بے چین ہے کچھ سمجھ نہیں آ رہی
اب تو میں اس بے وفا کے انتظار میں نہیں ہوں

میں اپنی منزل کی جانب اپنے راستے پر جا رہی ہوں
گر رہی ہوں اٹھ رہی ہوں لیکن تیرے انتظار میں نہیں ہوں

اے ساقی محبت بے خودی ہے تیری مست آنکھوں کی
میں میخانے میں مینا کے انتظار میں نہیں ہوں

اس دنیا میں بنی نوع انسان کی خدمت کرتی رہوں گی
خود ہی زندہ ہو جاؤں گی مسیحی کے انتظار میں نہیں ہوں

اے شاہین اب اپنے حصے کا کام کر رہی ہوں
آئندہ آئے گا میں آئندہ کے انتظار میں نہیں ہوں

❖❖❖❖

کانفرنسز اور سیمینارز میں شرکت

- سال ۱۹۸۰ اور سال ۱۹۸۱ میں انٹرنیشنل ویمن کانفرنسوں میں شرکت کی۔ اور مضمون بعنوان "پشتو سوسائٹی میں عورت کا مقام" پڑھا۔
- سال ۱۹۹۸ میں پاکستان اہل قلم کانفرنس میں شرکت کی۔
- سال ۱۹۹۵ اور ۱۹۹۸ میں پشاور یونیورسٹی کے سمر کیمپ باڑہ گلی میں سیمینارز کا انعقاد کیا اور مضامین پڑھے۔
- علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد میں علامہ اقبال پر منعقدہ سیمینار میں "علامہ اقبال اور اکیسویں صدی" کے موضوع پر مضمون پڑھا۔
- سال ۲۰۰۳ میں "اقبال اور اکیسویں صدی" کے موضوع پر مضمون پڑھا۔
- اکادمی ادبیات پاکستان میں منعقدہ سیمینار میں مضمون پڑھا۔ موضوع تھا: "عالمی تناظر میں پاکستانی کلچر اور بدلتی دنیا میں ادب کا کردار"
- خوشحال خان کی حیات اور فن پر ۳۰ اگست ۲۰۰۵ اکادمی ادبیات پاکستان میں مضمون پڑھا۔
- مارچ ۲۰۰۵ میں "پشتو ادب اور تھیٹر" کے عنوان سے اکادمی ادبیات پاکستان میں مضمون پڑھا۔
- "ادب میں خواتین کا حصہ" اس عنوان سے بھی اکادمی ادبیات پاکستان میں مضمون پڑھا۔

****

اعزازات

- تمغہ امتیاز ۔ حکومت پاکستان ۲۰۰۸
- اباسین آرٹس کونسل ایوارڈ ۱۹۸۳
- پشتون کلچر ایسوسی ایشن اسلام آباد ایوارڈ ۱۹۹۳
- اکادمی ادبیات پاکستان ہجرہ ایوارڈ ۱۹۹۶
- چاچا کریم بخش ایوارڈ ۱۹۹۹
- فخر مردان ایوارڈ ۱۹۹۷
- تعمیر ایوارڈ ضلع پشاور ۲۰۰۳
- خویندو ادبی لخکر اعتراف فن ایوارڈ ۲۰۱۷

****

سرکاری و غیر سرکاری ممبر شپ

- ممبر سیلیکشن کمیٹی کمال فن ایوارڈ اکادمی ادبیات پاکستان
- ممبر بورڈ آف گورنرز اکادمی ادبیات پاکستان
- ممبر پاکستان الیکٹرانک میڈیا ریگولیٹری اتھارٹی آف کمپلینٹ
- ممبر بورڈ آف پلاننگ کمیشن اسلام آباد
- ممبر کمیشن انسانی حقوق پشاور
- ممبر بورڈ آف گورنرز عورت فاؤنڈیشن پشاور
- ممبر اے ایس آر وومن سٹڈی سنٹر لاہور
- ممبر سینیٹ پشاور یونیورسٹی
- ممبر اکیڈمک کونسل پشاور یونیورسٹی
- ممبر گریجویٹ سٹڈیز کمیٹی ایم فل پی ایچ ڈی پشتو ڈیپارٹمنٹ
- ممبر فرنٹیئر پرائمری ہیلتھ کیئر یونٹ مردان
- ممبر سلیکشن بورڈ بلوچستان یونیورسٹی
- ممبر بورڈ آف ڈائریکٹرز ایریا سٹڈی سنٹر پشاور یونیورسٹی
- ممبر کلچرل ٹاسک فورس تعمیر پختونخوا
- ممبر ریڈ کریسنٹ سوسائٹی پشاور
- ممبر بورڈ آف گورنرز (باچاخان چیئر) عبدالولی خان یونیورسٹی مردان
- ممبر سینٹ کوہاٹ یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی
- ممبر بورڈ آف ڈائریکٹر پختونخوا سٹڈی سنٹر باچاخان یونیورسٹی چارسدہ
- ممبر مشاورتی کمیٹی برائے ریجنل لینگویجز ایچ ای سی اسلام آباد

مطبوعہ تصانیف

- اباسین د تاریخ پہ آئینہ کے ۱۹۸۰
- روانی سندرے جلد اول، دوم ۱۹۸۳
- نوے سحر (پشتو شاعری)
- پہ پشتو پہ معاشرتی، ثقافتی اثر ۱۹۸۵
- زہ ہم شخے وژووے (شاعری)۱۹۹۶
- کہ رخوا شوہ (پشتو ناول)۱۹۹۸
- کاغذی اوزرتی (پشتو افسانے ۲۰۰۱)
- دل اور آنکھیں چمن میں (اردو سفر نامہ ۲۰۰۳)
- پشتو میں جدید نظم (مقالہ پی ایچ ڈی ۲۰۰۳
- پشاور شہر اور روایات
- پشتونوں کے موسیقی کے آلات
- رابیل (پشتو شاعری)۲۰۰۳
- انتخاب شاہین (پشتو شاعری)

- "بدلتی ہوئی دنیا میں ادب کا کردار" اکادمی ادبیات اسلام آباد۔ فروری۔ ۲۰۰۵
- "اکیسویں صدی اور پاکستانی زبانوں کا مستقبل" اکادمی ادبیات پاکستان۔ اگست ۲۰۰۵
- "پاکستانی ثقافت، عالمی تناظر" اکادمی ادبیات اسلام آباد۔
- "علامہ اقبال اور اکیسویں صدی۔ اگست ۲۰۰۵ اکادمی ادبیات اسلام آباد
- "معیار زندگی میں پیش رفت اور صوبہ سرحد کا مستقبل" پشتو جرنل۔ اکتوبر دسمبر ۲۰۰۸
- "پشتون خواتین نثر نگار" علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی مارچ۔ ۲۰۰۹
- "افغانوں کے خفیہ راز اٹھارویں صدی" پشتو جرنل۔ اکتوبر ۲۰۱۱ جون ۲۰۱۲
- پازہ گی سیمینار۔
- "پشتو سکرپٹ مقالہ۔
- "پشتو فوکلور مقالہ۔ ۱۹۹۲
- "پشتو فوک لٹریچر۔ ۱۹۹۳۔
- "د پشتو اکیڈمی سوینئر کال۔ ۱۹۹۵۔

سلمیٰ شاہین کی چھاپ شدہ مطبوعات

- نوے سحر۔۔ شعری مجموعہ۔۔۱۹۸۳
- اباسین د تاریخ پہ آئینہ کی۔ ۱۹۸۴
- د پښتو پی معاشرتی ہ وکالتی اثر تحقیقی او تجزیاتی اثر دے۔ ۱۹۸۹
- محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں سرصاحبزادہ عبدالقیوم صدارتی خطبہ۔ ترجمہ
- روہی سندری اول جلد۔ ۱۹۸۳
- روہی سندری دوم جلد۔ ۱۹۸۳
- د پښتو آواز "پښتو مجلہ اداریوں کا مجموعہ
- "بیکاری" ترجمہ
- پہ پښتو کی جدید نظم۔ تحقیق۔ ۲۰۰۳
- زولا عقسی وزروے۔ شعری مجموعہ۔
- راوڑل۔ شعری مجموعہ۔ ۲۰۰۳
- کاغذی اوازتی۔ افسانے۔ ۲۰۱۰
- کرزتزاشوہ۔ ناول۔ ۲۰۱۴
- تور سری۔ تحقیق و تدوین۔ ۲۰۰۵۔ جدون پرنٹنگ پریس پشاور۔
- انتخاب شاہین۔ شعری مجموعہ

****

کتابیات

- "موزونہ شمس" تحقیق پروفیسر افضل رضا۔ پشتو اکیڈمی۔۲۰۰۶۔
- "ادبی تنقید" پروفیسر ڈاکٹر نسیم خٹک۔ پشتو اکیڈمی۔۲۰۰۸
- "پختو ادب کی دمیر منو برخہ" پروفیسر شاجہان۔ پشتو اکیڈمی
- "گل مینہ" ناول۔ جہانزیب یار۔ جدون پرنٹنگ پریس پشاور۔۲۰۰۵
- "پختو ناول پہ وده کی دمیر منو برخہ"۔ رشید احمد خان پشتو اکیڈمی کوئٹہ
- "توے سحر" شعری مجموعہ۔ پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین۔ پشتو اکیڈمی ۱۹۸۳
- "راویل" شعری مجموعہ۔ پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین۔ پشتو اکیڈمی ۲۰۰۳
- "کاغزی اوازونی" افسانے۔ پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین۔ پشتو اکیڈمی۔۲۰۱۰
- "کہ رنڑا شوہ" ناول۔ پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین۔ ۲۰۱۲
- "روشنی ہوتی تو" اردو ترجمہ ناول پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین مترجم۔ نجیب جان۔ ۲۰۱۳ جدون پرنٹنگ پریس پشاور
- "انتخاب شاہین" شعری مجموعہ۔ پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین۔ پشتو اکیڈمی۔
- "زوال حقیں ولاړ دے" شعری مجموعہ۔ پروفیسر ڈاکٹر سلمیٰ شاہین۔
- "پشتو افسانے کے سو سال" پروفیسر اسیر منگل۔ منگل کتاب کور۔ جنگی محلہ پشاور۔ ۲۰۱۷۔
- "مقالہ" پروفیسر ڈاکٹر فرخندہ لیاقت مجلہ پشتو۔ جولائی اگست۔۲۰۱۸۔
- "پختو لونگوره ته د پروفیسر داور خان داود بختی یو تنقیدی جائزہ۔ پختو شعبہ پشاور یونیورسٹی۔ ڈاکٹر زر محمد منگل۔ مقالہ پی ایچ ڈی غیر مطبوعہ۔۲۰۲۲۔
- "پختانہ لیکوال" جلد دوم ہمیش خلیل ۲۰۱۱۔

- "پشتو اکیڈمی کی علمی اور تدوینی خدمات پی ایچ ڈی مقالہ غیر مطبوعہ شعبہ پاکستانی زبانیں۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی۔ اسلام آباد۔ پروفیسر ڈاکٹر جہان عالم۔ ۲۰۱۸
- "د جدید دور پختنی شاعرانی "۱۹۵۰ نہ تا دم" هارون رشید خٹک۔ ۲۰۱۷ اعراف پرنٹرز پشاور۔
- "پشاور شہر اور روایات " پروفیسر ڈاکٹر سلمی شاہین۔ لوک ورثہ پشتو اکیڈمی۔ امین پرنٹنگ پریس پشاور۔ ۲۰۰۷۔
- "د پختو شاعرئ آئینہ" رحمت شاہ سائل عامر پرنٹنگ پریس پشاور۔ پختو ادبی جرگہ ملاکنڈ ۲۰۱۲۔
- "سوات کی لوک کہانیاں" تحقیق و ترجمہ۔ عنایت الرحمن پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی۔
- "پختو او مستشرقین "پی ایچ ڈی مقالہ ڈاکٹر جاوید خلیل۔ پشتو اکیڈمی۔ ۲۰۱۱۔
- "د چارسدی شاعران "تالیف۔ حمیش خلیل۔ پشتو اکیڈمی۔ ۲۰۰۷۔
- "ورک د سوان لیدل شہ "شعری مجموعہ امیر نواس خان امیر۔ ۲۰۰۰۔
- "ادب تراش "آٹو بائیو گرافی پروفیسر محمد نواز طائر۔ پشتو اکیڈمی پشاور۔ ۲۰۰۶۔
- "تور گلاب "افسانی کلثوم زیب۔ اعراف پرنٹرز جنگی محلہ پشاور۔ ۲۰۱۸۔
- "اردو اور پشتو کے نمائندہ افسانے "تقابلی جائزہ عظمت حما۔ ایم فل مقالہ۔ جدون پرنٹنگ پریس پشاور ۲۰۰۵۔
- "تور سری" تحقیق و تدوین پروفیسر ڈاکٹر سلمی شاہین۔ پشتو اکیڈمی جدون پرنٹنگ پریس پشاور ۲۰۰۵۔
- "د خوند توری "تالیف جمیل یوسفزئی۔ پشتو اکیڈمی ملت پرنٹرز لاہور
- "پشتو" سہ ماہی مجلہ جولائی اگست ستمبر۔ پشتو اکیڈمی ۲۰۰۶۔
- "پشتو" سہ مجلہ جولائی اگست ستمبر۔ پشتو اکیڈمی۔ ۲۰۰۳
- "پشتو" سہ ماہی مجلہ اکتوبر نومبر دسمبر۔ پشتو اکیڈمی پشاور۔ ۲۰۰۵۔
- "پشتو" سہ ماہی مجلہ جولائی اگست ستمبر۔ پشتو اکیڈمی۔ ۲۰۰۵۔
- "پشتو" سہ ماہی مجلہ جنوری فروری مارچ۔ پشتو اکیڈمی۔ ۲۰۰۵۔

- "پشتو" سہ ماہی مجلہ جنوری، فروری، مارچ پشتو اکیڈمی یونیورسٹی۔۲۰۰۹۔
- "پشتو" سہ ماہی مجلہ جنوری، فروری، مارچ پشتو اکیڈمی پشاور۔۲۰۰۹
- "پشتو" سہ ماہی مجلہ پشتو، انگریزی اکتوبر ۲۰۱۱ جون ۲۰۱۲ پشتو اکیڈمی۔
- "پشتو" سہ ماہی مجلہ پشتو، انگریزی پشتو اکیڈمی جنوری تا جون۔۲۰۱۳
- "زرغون فکرونہ" جنوری تا جون۔ پشتو اکیڈمی پشاور یونیورسٹی پشاور۔۲۰۰۹۔
- "منتخب پشتو افسانے" انتخاب و ترجمہ۔ پروفیسر ڈاکٹر اسماعیل گوہر۔ اکادمی ادبیات پاکستان۔ قسط پریس اسلام آباد۔۲۰۲۱۔
- "د شعور ڈالئ" پروفیسر محمد نواز طائر۔ پشتو اکیڈمی۔ جدون پرنٹنگ پریس پشاور۔۱۹۸۱۔
- "دل اور آنکھیں چین میں" سفر نامہ چین۔ پشتو اکیڈمی جدون پرنٹنگ پریس پشاور

＊＊＊＊